مارک ٹوین

میری لائبریری

(۱۰۸)

مارک ٹوین

میری لائبریری
(۱۰۸)

میری لائبریری میں ادب وتنقید اور تاریخ وسوانح کی دوسری کتابیں

اُردو کا بہترین انشائی ادب ،
مرتب ڈاکٹر وحید قریشی
جواہر ریزے ، مولانا ظفر علی خاں
غبارِ خاطر ، ابوالکلام آزاد
تذکرہ ، ابوالکلام آزاد
ادب کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر سلام سندیلوی
تنقیدی مضامین (اصنافِ شعر) عابد علی عابد
متاعِ ادب ، اظہر زیدی
ادب اور تعصب ، اکبر امامی
ناول نگاری ، ڈاکٹر سہیل بخاری
مطالعۂ سرشار، مرتب ڈاکٹر احراز نقوی
پنجابی ادب کی مختصر تاریخ ، احمد حسین قریشی
مطالعۂ ولی ، مرتب محمد خاں اشرف
دیوان ولی ، محمد خاں اشرف ، حسرت موہانی
دیوان مصحفی ، فراق گورکھپوری ، حسرت موہانی
دیوان آتش ، وحید قریشی ، حسرت موہانی
دیوان جرأت ، حسن عسکری ، حسرت موہانی
انتخاب غالب ، مرتب سید اختر عباس
دیوان غالب ، (اُردو) مقدمے اور شرح کے ساتھ
دیوان غالب ، (فارسی) مرتب وزیرالحسن عابدی
روشِ نگارش ، (فارسی) کاظم رجوی
ارنسٹ ہیمنگوے ، (تنقیدی مطالعہ) سلیم الرحمان
ولیم فاکنر ، (تنقیدی مطالعہ) سلیم الرحمان

لذّتِ آوارگی ، (دیوان) اے۔ڈی اظہر
سفر دی رات ، (پنجابی کلام) منیر نیازی
ابوبکر ، صدیقِ اکبرؓ محمد حسین ہیکل
عمر ، فاروقِ اعظمؓ محمد حسین ہیکل
دس بڑے مسلمان ، محمد اسماعیل پانی پتی
الحسین رضؓ عمر ابوالنصر
الزہرا رضؓ عمر ابوالنصر
الہارون ، عمر ابوالنصر
المامون ، شبلی نعمانی
خالد ، سیف اللہؓ ، ابوزید شبلی
ابوذر غفاریؓ ، عبدالحمید جودۃ السحار
امام زین العابدینؓ ، عبدالعزیز سید الاہل
رابعہ بصری ، وداد السکاکینی
عمر بن عبدالعزیزؓ ، احمد زکی صفوت
امیر معاویہؓ ، انیس زکریا
شیخ عبدالقادر جیلانی ، غلام حیدر سہیل
ایک مفسرِ قرآن ، چودھری محمد یوسف
سلطان محمد فاتح ، محمد مصطفٰے صفوت
الکمال ، خورشید بخاری
عبداللہ بن عمر ، سلام اللہ صدیقی
قلوپطرہ ، آرتھر ویگل
سلطانی محلوں کے راز ، جمال پاشا الغزی
روپ متی ، سید فیاض حسین

مارک ٹوین

تنقیدی تعارف

مصنّف: بیوئس لیئری

مترجم: پروفیسر سجاد حارث

مکتبہ: میری لائبریری لاہور

اُردو میں ترجمہ اور اشاعت کے حقوق ناشرین سے حاصل کئے گئے ہیں

میری لائبریری میں پہلی بار ۱۹۶۶ء

طبع اوّل : ۳۰۰۰

ناشر : بشیر احمد چودھری ڈائریکٹر

مکتبہ : میری لائبریری لاہور ۲

طابع : مکتبہ جدید پریس لاہور

920
ل 31 م

کتاب خانہ سردار جھنڈیر
میلسی (پاکستان)

نمبر شمار : ....

کتاب نمبر : ....

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
ACC NO 9145
★ MAILSI ★

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

MARK TWAIN, *by Lewis Leary*

Copyright 1960 by The Univeristy of Minnesota

فہرست

ننھّے کامران کے نام ـــــــــــــــ

سجّاد حارث

پیش لفظ

المیرا (نیویارک) کے نزدیک، ایک فارم سے ملحقہ کمرے میں، ایک دُبلا پتلا شخص جس کا سر اس کے بدن کے مقابلے میں قدرے بڑا ہے، صبح سے شام تک لکھنے میں مصروف رہتا ہے۔ جوں ہی وہ ایک صفحہ لکھ ڈالتا ہے، وہ اسے فرش پر گرا دیتا ہے، پھر دوسرا لکھنا شروع کر دیتا ہے، شام کو وہ ان لکھے ہوئے صفحات کو اکٹھا کرتا ہے، اگن کر انہیں فارم ہاؤس لے جاتا ہے جہاں اسکی بیوی اور بیٹیاں روزانہ اس وقت اس کا انتظار کرتی ہیں۔

یہ اگست ۱۸۸۳ء کا ذکر ہے۔ ان دنوں سیموئل لینگ ہارن کلیمنز (مارک ٹوین) اپنی شہرۂ آفاق کتاب "ہکل بیری فن کی مہمات" کا اختتامیہ لکھ رہا تھا۔ اِس کتاب کو لکھتے وقت، سیموئل کلیمنز کو یہ گمان تک نہ تھا کہ ایک دن اس کی یہ کتاب جدید امریکی ادب کا نقطۂ آغاز قرار پائے گی —— تاہم یہی وہ دن تھے جنہیں مارک ٹوین کے طویل کیریر، نیز امریکہ کی ادبی تاریخ کا کلائمکس کہا جا سکتا ہے۔

مارک ٹوین نے یہ کتاب سات برس پیشتر لکھنی شروع کی تھی۔ جب یہ کتاب چھپ کر پیشہ ور نقادوں کی نظر سے گذری تو انہیں یہ مطلق پسند نہ آئی۔ بوسٹن سے شائع ہونے والے رسالے "TRANSCRIPT" نے اس شاہکار کتاب کو "بے مزہ،

بے وضع"، کہہ کر مسترد کر دیا۔ روایت پسند اہل الرائے نے منہ بناتے ہوئے کہا کہ "مصنّف ادبی فن کے اصول و قواعد سے قطعاً نابلد معلوم ہوتا ہے"۔ صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا نہ کیا بلکہ "شرفاء" اور محافظین اخلاقیات" نے بیک رائے اسے مخرّب اخلاق قرار دے دیا، نتیجتاً یہ کتاب کافی دنوں تک لائبریریوں میں بار نہ پا سکی۔

لیکن عمرانی تاریخ کا مطالعہ بعض عجیب اور دلچسپ حقائق کی نشان دہی کرتا ہے۔ مثال کے طور پر، ہر دور میں "طبقہ شرفاء" —— تاریخ کی کسوٹی پر —— بالآخر احمقوں کا طبقہ ثابت ہوا ہے۔ نام نہاد اخلاقیات کے ڈھنڈورچی انسانی علم، روشن خیالی اور ترقی کی راہ میں ہمیشہ سنگ گراں بنتے رہے ہیں۔ یہی کچھ حادثہ مارک ٹوین اور اسکی کتابوں کے ساتھ بھی پیش آیا۔ اسکی کتاب "ہکل بیری فن" کو پہلے میساچوسٹس لائبریری سے خارج کیا گیا، پھر نیو یارک سٹیٹ ریفارمیٹری نے اسے گندی کتاب کہہ کر اپنی الماریوں سے نکال پھینکا۔ ڈینور، اوماہا، بروک لین غرضیکہ جگہ جگہ "شرفاء" اور ثقہ لوگ، اس کتاب کو تختۂ دار پر کھینچتے پھرے۔ اس زمانے میں گنتی کے چند ہی لوگ تھے جو اس کتاب کی تاریخی اہمیت کو صحیح معنوں میں سمجھتے تھے۔ ان ہی چند لوگوں میں، نیو یارک ٹائمز کے کالم نویس ولیم ڈنگسٹن ایلڈن صاحب تھے جنہوں نے اسے اپنے دَور کی ایک بہترین کتاب کہہ کر روایت پسند اور وضعدار شرفاء کو دلی صدمہ پہنچایا۔ اسکے بعد ولیم ڈین ہاولز، سر والٹر بیسنٹ، اینڈریو لونگ، اور رابرٹ لوئی سٹیونسن جیسے بلند پایہ ادیبوں اور دانشوروں نے بے جھجک اسے امریکہ اور بعض اوقات تو دنیا کی عظیم ترین کتابوں کی فہرست میں شامل کر دیا——

ٹی - ایس - ایلیٹ نے "ہکل بیری فن" میں مارک ٹوین کو ایک ایسے عظیم ادیب کی حیثیت سے دیکھا جسکی مثالیں دنیا کی ہر زبان کے ادب میں چند ہی ملا کرتی ہیں۔ پولیٹزر۔ انعام یافتہ ناول (THE COINE MUTINY) کے شہرت یافتہ مصنّف ہرمن وُوک کا قول تو یہ ہے کہ مارک ٹوین کے بغیر، جیک لنڈن، او۔ ہنری، شہروڈ اینڈرسن، ڈریزر، ایف سکاٹ فٹزجیرالڈ، سنکلیر لیوئس، بوتھ ٹارکنگٹن، ہینکن، ارنسٹ ہیمنگوے اور ولیم فاکنر جیسے معروف زمانہ مصنّفین اور ان کے بیسیوں مقلدّین کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سب کے سب کسی نہ کسی نہج سے مارک ٹوین سے متاثر اور مستفید نظر آتے ہیں۔ بین ہیشت (BEN HECHT) ہنری ملر اور ولیم سارویان جیسی فن و ادب کی ممتاز ہستیوں نے تو ٹوین کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنے کا خود اعتراف کیا ہے۔

ادب کا نوبل انعام پانے والوں میں دنیا جن امریکی ادیبوں کو اچھی طرح جانتی ہے۔ ان میں ارنسٹ ہیمنگوے کی حیثیت بہت نمایاں ہے۔ ہیمنگوے نے ایک جگہ لکھا ہے۔ "تمام تر امریکی ادب کا ماخذ مارک ٹوین کی کتاب" ہکل بیری فن "ہے۔ امریکہ کے تخلیقی ادب کا سرچشمہ یہ واحد کتاب ہی ہے۔ اس سے پیشتر اس پایے کی کتاب امریکی ادب میں موجود نہ تھی، نہ ہی ایسی کوئی کتاب آج تک لکھی گئی ہے"۔

امریکہ کے افسانوی ادب میں جو چند کتابیں نہایت مقبول و معروف رہی ہیں ان میں "سکارلیٹ لیٹر"، موبی ڈک" "پورٹریٹ آف اے لیڈی" وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن اپنے دور کی یہ تمام مشہور و مقبول کتابیں "ہکل بیری فن" کے آگے ماند پڑ جاتی ہیں۔

افسانوی ادب میں مارک ٹوین کی کامیابی کا راز وہ طریقۂ کار ہے جس سے وہ اپنی افسانوی تحریروں میں خود نوشت سوانحعمری کا سا انداز پیدا کر دیتا ہے۔ وہ اپنے اوائل

عمر اور جوانی کے تجربات و واقعات، جیتے جاگتے مناظر اور کردار اس خوبی سے پیش کرتا ہے کہ حقیقت اور تخیّل کے مابین امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور ہر واقعہ اپنا ذاتی تجربہ محسوس ہونے لگتا ہے۔ مارک ٹوین نے بچپن اور جوانی کے ایام —— جو چودہ برسوں پر محیط ہیں —— ہینی بال قصبے میں گذارے تھے۔ اس کی بہترین افسانوی تحریروں میں یہ ایام مختلف انداز سے منعکس ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہاولز نے مارک ٹوین پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک بار کہا تھا۔ "اس کا دل ایک لڑکے کا لیکن دماغ ایک دانا و بینا انسان کا ہے"۔ کسی اور ادیب نے اپنے لڑکپن کا ذکر اتنی شدّ و مد اور گہری بصیرت سے نہیں کیا جتنا کہ سیمول کلیمنز (مارک ٹوین) نے۔ اگرچہ اپنی زندگی میں اس نے مختلف مقامات پر قیام کیا، ملک ملک اور قریہ بہ قریہ وہ گھومتا بھی پھرا، لیکن ہینی بال ہی وہ واحد مقام ہے جس نے اسکی عظیم اور بہترین کہانیوں کا پس منظر مہیّا کیا۔ جوں جوں وہ اپنی عمر کی منزلیں طے کرتا رہا، وہ اپنی زندگی کے اس "سنہرے زمانے" کو اتنی ہی شدت سے یاد کرتا رہا —— بالآخر "ٹام سائر" اور "ہکل بیری فن" میں ہینی بال محض امریکہ ہی کا ایک قصبہ نہیں رہتا بلکہ "ٹام" اور "ہک" کی وساطت سے، وہ تمام دنیا کے لڑکوں کا وطن مالوف بن جاتا ہے۔

مارک ٹوین کے لڑکپن میں ہینی بال، کس انداز کی بستی تھی، ایک جھلک ذرا اسکی بھی دیکھتے چلئے —— غلاموں اور آقاؤں پر مشتمل یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ آدھی سے زیادہ آبادی جنوبی باشندوں کی ہے۔ یہاں عام طور پر کھیت بہت چھوٹے چھوٹے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جنوبی علاقوں کے برعکس —— جہاں بڑے پیمانے کی کھیتی باڑی

یا شجر کاری میں مویشیوں کی طرح غلام استعمال کئے جاتے ہیں —— اس جگہ کے حبشی غلام زیادہ تر گھریلو ملازم ہیں۔ اگرچہ ان کے ساتھ دیگر حبشی غلاموں کے بمقابلہ بہتر سلوک کیا جاتا ہے تاہم انہیں انسان یہاں بھی نہیں سمجھا جاتا، انہیں ذاتی ملکیت ہی تصوّر کیا جاتا ہے —— ہکل بیری فن کا کردار ہک اسی سرزمین کا لڑکا ہے، نیگرو جم بھی اس بستی ہی کا غلام باشندہ ہے، ٹوین اگر چاہتا تو ہک کو مکمل طور پر ایک فرشتہ سیرت کردار بنا کر بھی پیش کر سکتا تھا لیکن ایسا کرنا حقیقت حال کے منافی ہوتا، وہ اگر ادنیٰ درجے کا فنکار ہوتا تو وہ ہینی بال کو اپنی خواہشات کے آئینے ہی میں پیش کرتا لیکن ٹوین نے ایسا نہ کیا، قابل غور بات یہ ہے کہ ہک کے دل میں اگرچہ جم کے لیے بے پناہ محبت ہے لیکن پھر بھی جم کے مالک کی جانب جو اس کا فرض ہے وہ اسے نہیں بھول پاتا، اس کشمکش میں مبتلا ہو کر اکثر وہ پریشان ہو جاتا ہے، ایک خاص قسم کے ماحول میں انسان کے ذہن اور ضمیر کا جو حلیہ بگڑتا ہے، ہک اس حقیقت کا ایک دلچسپ مطالعہ ہے۔ ہک کا ضمیر محض ایک انسان کا ضمیر نہیں ہے بلکہ ایک پورے علاقے کا ضمیر ہے، فرد اور ماحول کے اس باہمی ربط و رشتے نے ہک کے کردار میں اصل زندگی جیسی قوت اور تازگی پیدا کر دی ورنہ ہک کا کردار بے جان اور سپاٹ بن کر رہ جاتا —— یہ بات اس پس منظر میں اور بھی زیادہ آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے کہ ٹام سائر اور اس کے دستوں کی طرح، ٹوین بھی اپنے لڑکپن میں، تمام حبشیوں کو اپنا دوست سمجھتا تھا، اپنے ہم عمر حبشیوں کے ساتھ اسکی گہری موانست تھی، اس نے ایک جگہ خود اعتراف کیا ہے، ایک بار اس نے کچھ حبشیوں کو زنجیروں میں جکڑے دیکھا تھا، ان کے چہروں کی یاسیت اور اداسی کا کربناک تاثر وہ اپنے ذہن سے زندگی بھر نہ مٹا سکا —— اپنی ان

ہمدردیوں کا اظہار وہ بہ آسانی ہک کی ذات میں منعکس کر سکتا تھا، اس صورت میں جم کے ضمیر میں کسی مرحلے یا موقعہ پر کشمکش پیدا ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔ تاہم مارک ٹوین نے ہک کو خالص انسانی سطح پر ہی رکھ کر سوچا، اسے اپنے احساس اور نظریے کے سانچے میں میکانکی طور پر ڈھالنے کی سعی نہیں کی اور ممکن ہے، اسی احتیاط نے ہک کو امریکی ادب کا زندہ جاوید کردار بنا دیا ہو —— انہیں خصوصیات کی بنا پر مارک ٹوین کا ایک سوانح نگار آرکیبالڈ ہنڈرسن، ٹوین کو ایک ایسا عظیم امریکی کہہ کر یاد کرتا ہے "جس نے اپنے ملک اور عہد کو اتنے مکمل طور پر سمجھا اور پیش کیا ہے جتنا کہ آج تک کسی اور امریکی نے نہیں کیا"، اسی لیے ہنڈرسن اسے "ایک ایسا فلسفی اور ماہر عمرانیات" کہتا ہے "جو انسانی افعال کے محرکات و جذبات کے پوشیدہ سرچشموں کو باطنی طور پر سمجھتا تھا"۔ یہی وجہ ہے کہ بعض امریکی نقاد ٹوین کو محض امریکہ کا ایک قومی مزاح نگار کہنا اس کے ادبی مرتبے کے منافی سمجھتے ہیں، وہ اسے ساری دنیا کا ادیب کہتے ہیں، کیونکہ، ان کے قول کے مطابق، اس کی تحریریں عام طور پر علاقائی اور جغرافیائی حد بندیوں کو پھلانگ کر بنیادی طور پر انسانی فطرت کا جائزہ لیتی ہیں۔ اس بات کو ایک امریکی نقاد یوں بیان کرتا ہے کہ ہنری جیمز اور مارک ٹوین امریکی کلچر کے دو ستون ہیں، دونوں کی حیثیت ایک سکے کے دو اطراف کی مانند ہے، چند جزوی اختلافات کے باوجود دونوں کے یہاں کچھ بنیادی قدریں مشترک ہیں، مثال کے طور پر دونوں ہی فرد کی حیثیت اور سالمیت کے بارے میں تشویش کا اظہار کرتے ہیں، ہک ہو یا ازابیل آرچر، دونوں کردار خیر و شر کے الجھیڑوں میں پھنستے ہیں، دونوں ہی اپنے مخصوص اور منفرد رنگ میں مزاحیہ ہیں، ان کی ہمہ گیر انسانیت کا یہ بین ثبوت ہے

کہ دونوں ہی اپنے ہمعصر عظیم روسی ناول نگار ٹرگنیف سے کسی نہ کسی نہج سے متاثر نظر آتے ہیں، ان تینوں کے ہاں پلاٹ سے زیادہ کہانی کے مرکزی کردار (یا بالفاظ دیگر، اسکی شخصیت میں موجود، "خالص انسانی عنصر") کو نمایاں کرنے پر زور صرف کیا جاتا ہے۔ پس منظر اور واقعات کا انتخاب بھی اس زاویہ نظر سے کیا جاتا ہے کہ مرکزی کردار، اپنی تمام تر انسانی خوبیوں اور کمزوریوں کے ساتھ، بھرپور طریق سے ہماری نظروں کے سامنے آ سکے۔ علاقائی حد بندیوں میں محصور ادیب، گرد و پیش کے انسانوں کو کبھی اس بلندی سے نہیں دیکھ سکتا، وہ کسی صورت میں ایسا مرکزی کردار تخلیق نہیں کر سکتا جسکی انسانی خصوصیات اتنی بھرپور اور جاندار ہوں کہ وہ ہمہ گیر انسانیت کی نمائندگی کر سکے۔

جس حقیقت کی جانب میں نے سطور بالا میں اشارہ کیا ہے اسکی تائید اس قنوطیت سے بھی ہوتی ہے جو مارک ٹوین کے یہاں آخری ایام میں پیدا ہو گئی تھی۔ بعض لوگوں نے ٹوین کی اس قنوطیت پر بڑی بے دردی سے حملے کئے ہیں لیکن جنہوں نے ٹوین کے ذہن کا خلوص اور ژرف بینی سے مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس قنوطیت کی تہہ میں ٹوین کی ہمہ گیر انسان دوستی، دردمندی اور آئیڈیلزم کارفرما تھا، ہر ذہین اور جینیس انسان کی طرح اس نے بھی نسل انسانی کے بارے میں کچھ خواب دیکھے تھے، وہ انسان سے ظالمانہ طور طریق، کمینگی اور اخلاقی پستی کی توقعات نہ رکھتا تھا، اوائل عمر میں وہ بنی نوع انسان کے بارے میں ایک شاعر اور مثالیت پسند فرد کی طرح سوچتا تھا لیکن زندگی کے تجربات و مشاہدات نے اسکی مثالیت پسندی کے بخئے ادھیڑ کر رکھ دئے، لڑکپن میں پہلے اس نے ہینی بال میں نہایت لرزہ خیز مناظر دیکھے، اس ضمن میں کہا جاتا ہے کہ اس نے خود اپنی نظروں سے کئی لوگوں کو بری طرح قتل ہوتے دیکھا تھا، بعد ازاں دریائے مسی سیپی پر اور

کان کنوں کے کیمپوں میں زندگی کے مختلف گھناؤنے روپ اس کے مشاہدے میں آئے۔ یہ تمام مشاہدات اور تجربات اسکے ذہن کی تشکیل و تعمیر کرتے رہے، بالآخر جب اسکی زندگی کے ذاتی سانحات اور حادثات رونما ہوئے تو وہ بے پناہ غم و غصّے کے بوجھ تلے دب کر، قنوطیت پسند بن گیا، وہ اب یہ سوچ سوچ کر کڑھنے لگا کہ نسل انسانی کے مقدر میں اذیتوں اور بے انصافیوں کے سوا کچھ نہیں، اسکی سوچ کا یہی وہ لمحہ ہے جب وہ اپنی ذاتی زندگی کے المیوں میں بنی نوع انسان کا المیہ دیکھنے لگتا ہے۔ وہ انسان کے تاریک ماضی و حال کو دیکھ کر مستقبل سے مایوس ہو جاتا ہے۔

لیکن اسکی ذاتی زندگی کے المیوں پر غور کرتے ہوئے ہمیں ایک بات کسی مرحلے پر بھی نہیں بھولنی چاہیئے وہ یہ کہ مارک ٹوین ایک عام انسان ہوتے ہوئے بھی ایک عام انسان نہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی عزیز ترین ہستیوں کی موت یا مادی زندگی کے نفع و نقصان کو وہ عام انسانوں ہی کی طرح محسوس کرتا تھا لیکن ٹوین چونکہ ایک صاحب فکر انسان اور فنکار بھی تھا اس لیے اسکی روح کے سرطان عام لوگوں کے سرطانوں سے نہ صرف مختلف نوعیتوں ہی کے تھے بلکہ ان سے کہیں زیادہ شدید اور اذیت ناک تھے۔ یہ فنکار مارک ٹوین تھا جو معاشرے میں دولت اور عزت حاصل کرنے کے ساتھ ہی ساتھ ایک تخلیقی انسان بن کر بھی رہنا چاہتا تھا۔ ایک جانب اسکی اس نوع کی شدید آرزوئیں تھیں، دوسری جانب اس کے ہم چشم اور واقف مند افراد تھے، نیز وہ ہمعصر معاشرہ تھا جس میں عزت اور کامیاب زندگی کے مخصوص معیار تھے، اسکی اصل اور لاشعوری خواہش تو فنکار بننے کی تھی لیکن فنکار بن کر اپنی انفرادیت اور شخصیت کا اظہار کرنا اسکی ماں کے نزدیک ایک گناہ تھا اور ہمعصر معاشرہ کی نگاہوں میں شرمناک بات۔ اسکی ماں اور معاشرہ تو دراصل

اسکو ایک کامیاب بزنس مین بنانا یا دیکھنا چاہتے تھے - چنانچہ وہ زندگی بھر ایک داخلی اور لاشعوری کشمکش میں مبتلا رہا - یہ المیہ صرف مارک ٹوین کی زندگی ہی میں پیش نہ آیا اور بھی کئی امریکی ادیب اس نوع کی داخلی کشمکش کے جہنم سے گذرے ہیں - مارک ٹوین کی داخلی زندگی کا یہ خلفشار متعدد کاروباری معاملات میں اس کی ناکامی وتباہی کی صورت میں ظاہر ہوا - تاہم اس داخلی کشمکش اور تصادم کو اس نے ایک مزاح نگار بن کر ختم کرنے کی سعی کی - اس سلسلے میں اسکے ایک سوانح نگار وائن بروکس کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ مزاح نگار بننے کا فیصلہ اسکی روحانی تکمیل کا ثبوت نہیں بلکہ اس کی ذات میں موجود مخالف اور متضاد قوتوں کے مابین ایک قسم کا سمجھوتہ ہے - یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی تحریروں کو فنی کارنامہ نہیں سمجھتا تھا بلکہ اشیائے صرف کی طرح، انہیں دولت پیدا کرنے کا ایک ذریعہ سمجھتا تھا - اسی لیے اس نے اس معاشرے کی ہی قدروں اور آورشوں کو اپنا لیا تھا جس کے لیے وہ لکھتا تھا، وہ جیسی خواہش رکھتا ویسا نہ لکھتا بلکہ بازار کی طلب دیکھ کر لکھتا تھا - یہی وہ شکست آرزو تھی جو زندگی بھر اس کی روح کو گھن کی طرح چاٹتی رہی - وہ تخلیق حسن اور اپنی انفرادیت کے من وعن اظہار کے لیے آرزومند رہا لیکن اسے اپنا یہ پیدائشی حق دولت اور مقبولیت کے ہاتھوں بیچنا پڑا - آخری عمر میں جب صدمات اور صعوبتوں نے دنیوی کامیابی اور خوشحالی کے تمام تصورات اسکی نظر میں ہیچ اور بے معنی بنا دئے اس وقت اسے زندگی کی ناکامی ونامرادی کا بری طرح احساس ہوا اور پھر یہی احساس قنوطیت کے فلسفے پر منتج ہوا -

ان حقائق کے پیش نظر، یہ بات سمجھنی مشکل نہیں رہ جاتی کہ مارک ٹوین زندگی بھر ایک رنگا رنگ اور اداکار شخصیت کیوں بنا رہا اور اس نے زندگی میں مختلف رول کیوں ادا

کیجئے! نمود و نمائش اور انداز وضع کرنے میں اس کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات ثقہ عورتیں اسے پٹے ہوئے تصور کرنے لگتی تھیں اور مغربی کانوں کے کاروبار میں شریک کار کالون ایچ ہگبائی اسے اکثر اوقات پاگل سمجھتا تھا۔

اس کا آئیڈیلزم مختلف اوقات میں مختلف انداز لئے ظاہر ہوتا ہے۔ کبھی وہ ٹام سائر کے ذریعے اپنے لڑکپن کے امیجز (IMAGES) زندہ کرتا ہے، کبھی کرنل سیلرز کی شخصیت تخلیق کر کے اپنے خوابوں اور امیدوں کے محل بناتا ہے۔ کبھی کنیٹی کٹ کے یانکی کے ذریعے انگلستان کے بے جان ارادوں اور مضحکہ خیز روایات کو طنز و تنقید کا ہدف بناتا ہے، وغیرہ —— لیکن اس سلسلے میں اس کی کتاب "جون آف آرک" اس کی داخلی زندگی کی ایک اہم حقیقت کی غمازی کرتی ہے —— جب یہ کتاب شائع ہوئی تو مارک ٹوین نے عمداً اس کتاب پر اپنا نام نہ دیا، مبادا قارئین اسے بھی مزاحیہ کتاب سمجھ کر ہنسی میں نہ اڑا دیں، بحیثیت مزاح نگار، بلاشبہ ٹوین ایک معروف قومی شخصیت اور لیجنڈ بن چکا تھا لیکن اب ذرا دنیائے مزاح کے اس قومی ہیرو کی بے بسی ملاحظہ کیجئے، وہ نہایت سنجیدگی سے ایک سنجیدہ بات کہنا چاہتا ہے مگر عوام الناس سے اتنا خائف ہے کہ سنجیدہ بات کہنے کے لیے خود کو سات پردوں میں چھپاتا پھرتا ہے، دیکھا جائے تو یہ بیک وقت اس کی ذات کی عظمت بھی ہے اور ایک عظیم المیہ بھی۔

سٹیفن لیکاک، جو خود بھی ایک کامیاب مزاح نگار رہا ہے، مارک ٹوین پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک جگہ کہتا ہے کہ "مارک کی اس خواہش کو کہ اسے سنجیدہ ادیب کی حیثیت سے بھی دیکھا جائے، اس کی فطرت کا ایک خلقی خاصہ ہی سمجھنا چاہیئے"۔ لیکن سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ جب خود مزاح نگار اور اس کے قارئین اس خلقی خاصے کو درخورِ اعتنا نہ سمجھیں

تو اس صورت میں فطرت انسانی کے لیے قنوطیت کی راہ اختیار کرنے کے علاوہ دوسرا کیا چارۂ کار رہ جاتا ہے، انسانی فطرت ناگزیر اور ناقابلِ شکست حقیقت ہے، جب کوئی فرد اسے کسی مصلحت، دباؤ شعوری فیصلے یا ارادے کے تحت کچلنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ مسخ ہو کر کسی دوسرے روپ میں ظاہر ہوتی ہے، یہی بات مارک ٹوین کے ساتھ پیش آئی، اس نے اپنی فطری شخصیت اور ہمعصر معاشرے کے مابین جو سمجھوتے کی راہ نکالی، وقتی طور پر ٹوین کو اس سے مالی منفعت ضرور ہوتی رہی لیکن انجام کار اس سمجھوتے کی اسے ہمیشہ ایک بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ جب کبھی اسکی اصل جبلّت اور خلقی رجحانات اسے کچوکے دیتے تھے، وہ دنیا اور دنیا والوں کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھنے لگتا تھا، گاہ بہ گاہ ان پر برس پڑتا تھا، حتّٰی کہ بنی نوع انسان سے نفرت اور بیزاری کا اظہار تک کرنے لگتا تھا —— آخری عمر میں اس کی قنوطیت پسندی اس کے ضمیر اور ذہن کے ان کچوکوں ہی کی داستان ہے —— یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات اسکا ایمان ہر معقول اصول اور انسانی فہم و فراست تک میں متزلزل نظر آتا ہے، اس کے جن اقوال کو لوگ پر مزاح سمجھ کر ہنستے ہیں وہ دراصل حیات انسانی ہی کی پیروڈی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ وہ لکھتا ہے۔ "صبح سویرے اٹھو' یہ صبح اٹھنے والی چڑیا ہوتی ہے جو کیڑے مکوڑے پکڑتی ہے —— اس لغو کہاوت سے بیوقوف نہ بنو، میں ایک آدمی کو جانتا ہوں جس نے اس قول پر عمل کیا تھا، وہ طلوعِ آفتاب کے وقت اٹھ بیٹھا اور ایک گھوڑے نے اسے کاٹ لیا!"

وہ خود بھی اپنے بارے میں اس نوع کی لغو باتیں سن کر خوش ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک "لیکچر پروگرام" کے سلسلے میں پروگرام کے منتظم نے سامعین سے اس کا ان الفاظ میں تعارف کرایا:

دو خواتین و حضرات ! میں موصوف کے بارے میں صرف دو باتیں جانتا ہوں۔ اوّل یہ کہ آپ کبھی جیل نہیں گئے اور دوسری یہ کہ مجھے نہیں معلوم کہ کیوں نہیں گئے۔" وغیرہ

لیکن مارک ٹوین کو محض ایک اداکار شخصیت، قنوطیت پسند انسان یا محض مزاح نگار سمجھنا اس کی حقیقی عظمت سے بے انصافی کرنے کے مترادف ہوگا۔ یہ تو اس کی پہلودار شخصیت کی معدودے چند نمایاں اور اہم خصوصیات تھیں۔ ٹام اور ہک کی کہانیوں میں ـــــ وہ جن تاریخی، انسانی اور عمرانی بلندیوں کو چھوتا ہے، اس کا بھرپور تجزیہ کم ہی لوگوں نے آج تک کیا ہے۔ اس کی تحریروں میں امریکی اداروں کا جو وژن ملتا ہے، نیگرو نسل کے لیے جو ہمدردی اور دلسوزی ہے، غلامی کے بارے میں جو اس کا رویہ ہے، انسانی زندگی پر جو سنجیدہ اور گہری فکر ہے ـــــ اس کی شخصیت کے ان پہلوؤں پر گنتی کے چند نقادوں نے ہی اب تک توجہ دی ہے۔ قوم پرست امریکی نقادوں نے ٹوین کو خالص امریکی ادیب قرار دے کر اسے بے پایاں نقصان پہنچایا ہے۔ مارک ٹوین امریکہ میں رہتے ہوئے بھی ساری دنیا کا معزز ترین شہری تھا، اس نے صرف مٹتے ہوئے امریکہ کا ہی رزمیہ نہیں لکھا بلکہ بنی نوع انسان کی تقدیر کا رزمیہ بھی پیش کیا ہے۔ وہ صحیح مفہوم میں ایک جمہوریت پسند انسان تھا، وہ فرد کی اہمیت پر زور دیتا تھا اور تمام انسانوں کے لیے ـــــ کسی قسم کی تخصیص یا امتیاز کے بغیر ـــــ ترقی کے مساوی مواقع فراہم کرنے میں یقین رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب روس کا مشہور ادیب میکسم گورکی روس کی آزادی کے لیے چندہ اکٹھا کرنے امریکہ گیا تو مارک ٹوین نے کھلّم کھلّا اس کی حمایت اور اعانت کی۔ ۹۶-۱۸۹۵ء کے لگ بھگ، مارک ٹوین دنیا کا دورہ کرتا ہوا برصغیر پاک و ہند بھی آیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی کلارا بھی تھی۔ لکھنؤ، دہلی اور لاہور کی رومان پرور

فضاؤں میں اس نے اپنی زندگی کے یادگار شب و روز گذارے تھے۔ یہاں کے خاص و عام نے اس کی ہر طرح خاطر داری کی۔ پرنس کمار نے بالخصوص اس کی مدارات میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا، محلّات میں قیام کرنے اور راجوں مہاراجوں کی شان و شوکت دیکھنے کے باوجود اس ملک کی غربت دیکھ کر وہ بے حد ملول ہوا تھا۔ ایک گاؤں میں مٹّی اور گارے سے بنے ہوئے شکستہ مکانات دیکھ کر وہ آبدیدہ ہوئے بنا نہ رہ سکا اور بولا "یہ ایک غم انگیز سرزمین ہے —— ناقابلِ قیاس غربت اور صعوبتوں کی سرزمین !!!"

مارک ٹوین کی یہی وہ ہمہ گیر انسان دوستی ہے جو امریکہ سے باہر، اس کی شہرت، عزّت اور قدر و منزلت کا باعث بنی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر قسم کے تعصّبات سے بالاتر ہو کر، ٹوین کو زیادہ خلوص اور سنجیدگی سے سمجھا جائے اور اس کی شخصیت اور فن سے اُردو داں طبقے کو متعارف کرایا جائے۔

سجّاد حارث

لاہور
۳۰ر مارچ ۱۹۶۵ء

مارک ٹوین

بیشتر امریکی مارک ٹوین کے لیے ایک خاص شیفتگی محسوس کرتے ہیں۔ وہ اُسے ایک ایسے جھبرے بالوں والے انسان کی حیثیت سے جانتے ہیں جس نے لڑکپن کی بے اندازہ مہماتی کہانیاں سنائی تھیں۔ یہ کہانیاں گویا خود اُن کی اپنی آپ بیتیاں ہیں اور بالعموم اتنی پسندیدہ ہوتی ہیں کہ اُن کے اپنے ذاتی تجربے کا جزوِ لاینفک بن جاتی ہیں۔ اُس کی خوشدلانہ بے ادبی اور غیر عاجلانہ روش —— یہ دونوں میلانات اُن ذہنی رویّوں کے لیے تریاق معلوم ہوتے ہیں جنہیں امریکی لوگ ناگزیر طور پر، لیکن بادل نخواستہ قبول کر لیتے ہیں۔ اُن کی رائے میں امریکیوں کی شخصیت جیسی ہوتی آئی ہے یا ہو سکتی ہے اس کے ہاں اس شخصیت کا تصوّر بھی کچھ ایسا ہی انداز لیے ہوتا ہے —— اُن کے نزدیک امریکی لوگ حسِّ مزاح کے ساتھ فہم و ادراک رکھنے والے، تصنّع سے فریب نہ کھانے والے، اور اپنی مخصوص شخصی خصوصیات کی بنا پر ہر حالت میں کامیاب و کامران ہوتے ہیں۔

جب وہ ”عوارض کا عجائب خانہ اور آلائشوں کا گھر“ کی حیثیت سے انسان کی

تصویر کشی کرتے ہوئے بتلاتا ہے کہ یہ زندگی کا آغاز کثافت کے روپ میں کرتا ہے، اور عفونت کی شکل میں دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے، اور یہ کہ اُس کی تخلیق کا بظاہر کوئی خاص مقصد نظر نہیں آتا، بجز اُس کے کہ یہ جراثیم کی خوراک دضیافت کا سامان بن سکے، تو امریکی لوگ اُسے پڑھ کر لبسا اوقات توصیفی انداز میں مسکرانے لگتے ہیں۔ ٹوین کے یہ الفاظ بڑے بیباکانہ، اچھی طرح کڑوے اور کسیلے ہیں۔ اور کُفر کی حد تک عامیانہ ہیں۔ لیکن بہ ایں ہمہ یہ خندہ آور بھی ہیں۔ جب انسان کا ظہور ہوا تو عمل ارتقاء جواب دے گیا، کیونکہ تمام حیوانی دنیا میں یہ صرف حضرتِ انسان ہی کا دل ہے جو بُرائی کی پوٹ ہے۔ وہ صرف کینہ، انتقام اور بدمستی ہی کے قابل ہے۔ جب انسان ظالم نہیں ہوتا تو پھر بھیڑ کی طرح احمق ہوتا ہے۔ مارک ٹوین نے اظہار رائے کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ کتنی قابل تاسف بات ہے کہ حضرت نوح اور اُن کے حواری کشتی میں بیٹھنے سے نہ چوک سکے۔ پھر وہ ہمارے دَور کے زبردست کابُوس کی جانب قارئین کی توجہ مبذول کراتا ہے، اور متردد ہوتے ہوئے کہتا ہے کہ کہیں ایسی کوئی حکمت نہ نکل آئے، جس سے دو منٹ کے لیے ہوا سے تمام آکسیجن کھینچ کر بنی نوع انسان کو نیست و نابود کر دیا جائے۔

انسان کے "ضمیر چھنالہ" (VENALITY) سے متعلق وہ (امریکی) مارک ٹوین کی پُر ذہانت پردہ دری کی داد دیتے ہیں۔ لیکن وہ اُس کے سہل و صریح جذبے، دردمندی اور سادہ دل انکساری سے بھی تاثر قبول کرتے ہیں۔ لیکن ایک بار اُس نے اعتراف کیا تھا کہ ہر آدمی نسلِ انسانی میں جو کچھ دیکھتا ہے، وہ محض اُس کے اپنے قلب کی گہری اور نجی دیانت داری میں اُس کی اپنی ذات ہوتی ہے۔ ہر شے جو

انسانی ہے حسرت انگیز ہے۔ خود مزاح کا پوشیدہ سرچشمہ مسرت نہیں بلکہ غم ہے۔ بہشت میں مزاح نام کی کوئی شے نہیں ہے۔ اگر وہ آج دنیا میں موجود ہوتا تو رابرٹ فراسٹ کے اِس خیال سے اتفاق کرتا کہ یہ دھرتی ہی محبت کے لیے صحیح جگہ ہے۔ لیکن اِس میں اتنا اضافہ کر دیتا کہ یہ ناگزیر طور پر ٹھوکر کھانے اور پھر دیگر، قدیم تر اور قدرے کم رسوا زمانوں کو یاد یا اختراع کر کے اِس چوٹ کو بھول جانے کا مقام بھی ہے۔

یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ ارنسٹ ہیمنگوے نے تمام تر امریکی ادب کا نقطہ آغاز مارک ٹوین میں دیکھا تھا۔ ماضی، مہم جوئی اور مزاح جو حقیقت کے اندر اور حقیقت سے پرے کارفرما ہے، اِس جانب اس کا فرار ہیمنگوے کے اس فکری گریز سے مشابہت رکھتا ہے۔ جسے ہیمنگوے شراب، عورت اور مردانہ ریاضت کی سادہ تر لذّتوں کے ذریعے حاصل کرتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ مارک ٹوین کا سادہ تصریحی اندازِ نگارش ہیمنگوے کے اسلوب کے لیے ایک سرچشمہ ہے اور دنیا کی جانب اس کا بچگانہ اندازِ نظر ہیمنگوے (HEMINGWAY) ولا کیتھر (WILLA CAITHER) شیروڈ اینڈرسن (SHERWOOD ANDERSON) حتّی کہ جے۔ ڈی سالنگر (J. D. SALINGER) کے تصوّرات سے مماثلت رکھتا ہے بلکہ ۱۹۱۶ء میں "پُراسرار اجنبی" کی اشاعت اُس کو اس انداز سے منصّہ مشہور پر لاتی ہے گویا ایسے تمام خیالات کے مجموعے اُس کے ذہن پر بھی کاملاً چھائے ہوئے تھے جو ہنری آدمز (HENRY ADAMS) کے ازمنہ قدیم کی جانب مراجعت اور ساتھ ہی جو ہیمنگوے اور

اسکاٹ فٹز جیرالڈ کی 'نسل گم شدہ' اور ٹی ایس ایلیٹ کے 'ویسٹ لینڈ' کی قنوطیت کا سبب بنے ہیں۔

جس طرح اُس کے زمانے کے لوگوں کو باور کرانا مشکل تھا، بعینہٖ ہمارے اپنے زمانے میں یہ سمجھانا مشکل ہے کہ مارک ٹوین بجز ایک ڈرامائی کردار کے اور کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ اپنی سج دھج اور محتاط مشق و مزاولت سے عوام الناس کو نہایت ہوشمندی کے ساتھ محظوظ کیا کرتا تھا۔ ادبی اور نفسیاتی، دونوں ہی مفہوم میں وہ ایک ایسا نمائشی شخص تھا جس کی بذلہ سنجی میں ادراک اور سوجھ بوجھ بھی کارفرما تھی اور جسے مارک ٹوین کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ وہ تو ایک بہروپ تھا اور ایک ایسی آواز جس میں رکھ رکھاؤ دھیماپن اور تلوّن شامل تھا۔ وہ ایک ایسی رنگا رنگ اور اداکار شخصیت تھی جس کے پس منظر میں سیموئیل لینگ ہارن کلیمنز (SAMUEL — LANG HORNE CLEMENS) نامی آدمی موجود تھا ——

اور جسے اُس نے ماحول اور تاثر پذیر ذکاوت کی مدد سے جنم دیا تھا۔ وہ خیالی پیکر جزوی طور پر خود اُس کی اپنی ہی صورت گری ہے۔ لیکن اِس کی درستگی و اصلاح اس زیرکی کے ساتھ عمل میں لائی گئی ہے کہ وہ کردار جو مارک ٹوین ہے، کلیمنز کا انتہائی کامیاب کارنامہ بن جاتا ہے۔ ایک مخصوص ادبی رشتے کی وساطت سے مارک ٹوین کی آواز اپنے خالق سے گفتگو کرتی سنائی دیتی ہے۔

یہ بات غالباً درست ہے کہ یہ دونوں شخصیتیں کلیمنز کے ذہن میں اس طرح خلط ملط ہو گئی تھیں جس طرح اُن کے ہاں جنہوں نے مارک ٹوین کے تذکرے لکھے ہیں۔ تاہم یہ امتیاز اپنی جگہ اساسی نوعیت کا ہے۔ کون کیا ہے، اور کس

نے کس کے لیے کیا کچھ کیا ——— ؟ یہ اہم تنقیدی اُلجھن پھر بھی باقی رہتی ہے ۔ قرار واقعی سلاست سے بڑھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مارک ٹوین ایک ایسا کردار تھا جو لگ بھگ ہر اُس تحریر میں جو سیموئیل کلیمنز لکھتا خود کو ایک خوش طبع لا اُبالی پن کے ساتھ سمو دیتا تھا ۔ اُس کی مزاحمت نہیں کی جا سکتی تھی ، تاہم وہ خود آگاہ بھی تھا ۔ اپنے دور کی تشخیص میں اُس کی حیثیت ایک ایسے نمائندے کی تھی جو اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہمہ وقت مستعد رہتا ہے ۔ اُس وقت کامیابی کے جتنے تصوّرات رائج تھے اُن کی نمائندگی بھی اُس کے حصہ میں آئی تھی ۔ لیکن مارک ٹوین کے بارے میں اِس حقیقت کو نہ سمجھنا کہ وہ تو ایک وسیلہ تھا جس کے ذریعے کہانیاں کہی جاتی تھیں اور وہ محض ایک بالواسطہ مفہوم میں اُن کا مصنف تھا ، خود کو ایک ایسے حسین تحریصی جال میں پھنسانا ہے جو ہیمنگوے ، تھورو اور وھٹمین جیسے امریکی فنکاروں کے شارحین کے لیے کہیں زیادہ باعث کشش بن سکتا ہے ۔ کیونکہ متذکرہ بالا فنکاروں کے نقاب زیادہ باریک ہیں اور صاف طور پہ کم ہی نظر آتے ہیں ۔

کون سی آواز کب سنائی دیتی ہے ——— اِس بات کا تعیّن ہمیشہ نہیں کیا جا سکتا ، اور نہ ہر معاملے میں یہ امتیاز اہمیت ہی رکھتا ہے ۔ البتہ چند تحریروں میں جن میں سے بیشتر بہترین تخلیق کا درجہ رکھتی ہیں مارک ٹوین کی حیثیت مقرر کر دی جاتی ہے ۔ یہاں ایک ایسی آواز براہِ راست سنائی دیتی ہے ۔ جو تفنّن آمیزی یا غیظ و غضب سے ملوّث نہیں ۔ اِس بات کا دونوں آوازیں ہی اعتراف کر سکتی تھیں ——— جیسا کہ اِن میں سے ایک نے اعتراف کیا بھی ہے ۔ کہ اُس کی کتابیں

پانی کی مانند، اور عظیم نابغین کی شراب کے مثل ہیں ——— ! لیکن یہ مارک ٹوین ہی تھا جس نے اِس قول کو خاص معنی پہنا کر ہمیں یاد دلایا تھا کہ "ہر فرد و بشر پانی ضرور پیتا ہے۔"

جزوی طور پر اُس کا کردار ارباب علم و ادب میں ایک دنیوی انسان کا تھا، اور ساتھ ہی ایک ایسے صحافی کا بھی جو ناولوں اور شاعری کو تو قابلِ نفرت گردانتا ہے (جیسا کہ اس نے خود کہا ہے) لیکن تاریخ، سوانح، حیرت انگیز حقائق اور انوکھے واقعات کو پسند کرتا ہے۔

تاہم اہلِ امریکہ کے لیے یہ کبھی لازمی امر نہیں رہا کہ مارک ٹوین کا مطالعہ اسے محبت کے ساتھ یاد رکھنے کے لیے کیا جائے۔ غالباً اکثر لوگ ٹام سائر کے جنگلے پر سفیدی کرنے کے مشاقانہ طریقۂ کار کو پہلے ہی جانتے ہیں، نہ کہ یہ بات اُنہوں نے اُس کتاب کو پڑھ کر سیکھی ہے جس میں اِس کا تذکرہ موجود ہے۔ ٹام اور ہک شاہزادہ جو ایک قلّاش انسان بن گیا، یا کنیٹی کٹ کا وہ "یانکی"، جو بادشاہ آرتھر کے دربار میں "کھل جا سم سم" کا امریکی نسخہ لاتا ہے، یہ تمام فن پارے ہالی وُڈ کے قالب میں ڈھل کر اب تک ہزاروں ناظرین تک پہنچ چکے ہیں۔ انہیں یا تو طبعزاد صورت میں فلمایا جا چکا ہے یا ٹیلی ویژن کے لیے ان میں تصرّف کر لیا گیا ہے۔ ایک مقبولِ عام کامیڈین نے سلولائڈ کے کپڑے پہن کر اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ ایک قابلِ دید حبشی مکّے باز نے مفرور غلام کا کردار ادا کیا ہے۔ اِس غلام کی سادہ لوح وفاداری پہلے تو ہک فن (HUCK FINN) کو پراگندہ ذہن کر دیتی ہے، اور بعد ازاں اِس میں تبدیلیٔ رائے لے آتی ہے۔ ٹام سائر نے ایک غنائی طربیہ میں

ننگے پاؤں بڑی نزاکت اور پھرتی سے رقص کیا ہے۔ دو ممالک غیر میں سادہ لوح انسان،، کے غنائی تصرّف کے بارے میں بھی منصوبے زیرِ غور ہیں۔ ایک سے زیادہ اداکاروں نے مارک ٹوین کی طرح کپڑے پہن کر چبا چبا کر باتیں کرنے کو بہت نفع بخش پایا۔ کچھ قصّوں کو جنہیں مارک ٹوین بیان کیا کرتا تھا، وہ دوبارہ بیان کر کے ناظرین کو ہنسی سے لوٹ پوٹ کر دیتے ہیں۔

مارک ٹوین کی پُر معنی اور شائستہ گفتگو تضحیکی بیان اور غیر معمولی مبالغہ آرائی نے اُسے چالیس برس سے زیادہ نہ صرف پلیٹ فارم کی پسندیدہ شخصیت بنائے رکھّا، بلکہ ڈنر کی تقریبات کا ایک محبوب مقرّر بھی۔! اس کی بذلہ سنجیوں کا ایک زبان سے دوسری زبان تک چرچا رہتا تھا، اور اخبارات بھی انہیں من و عن چھاپا کرتے تھے۔ وہ اس حقیقت سے باخبر تھا، کیونکہ وہ بہترین معنوں میں ایک تماشے باز آدمی تھا جو خود کو اور اپنی کتابوں کو مؤثر طریق سے عوام الناس کے سامنے پیش کرنا جانتا تھا۔ اُس کے بھاری جھبرے بال جو کبھی سُرخ ہُوا کرتے تھے لیکن جن میں جلد ہی سفیدی جھلکنے لگی تھی، اِن کے باعث وہ اتنا بڑا دکھائی دیتا تھا جتنا دراصل وہ نہیں تھا۔ بعد ازاں اپنی زندگی میں اِس نے موسم گرما اور سرما میں سفید سرج اور فلالین کے کپڑے پہن کر اِس مغالطے کو قائم رکھا۔ اُس نے ابتدا ہی میں اپنی جانب توجہ منعطف کرانے اور اِسے برقرار رکھنے کا گُر سیکھ لیا تھا، اور اِس ہنر کو اِس نے اچھی طرح برتا بھی۔ بہرصورت وہ اپنی نسل کا مشہور ترین اور انتہائی کامیاب مصنّف تھا۔

وہ خود بھی اِس حقیقت کو سمجھتا تھا، کیونکہ کسی حد تک وہ ایک کاٹیاں قسم

کا کاروباری آدمی تھا اور اپنے بارے میں وہ اِس طرح سوچنا پسند بھی کرتا تھا۔ اس کی تقریریں اُس کی کتابوں کی فروخت میں بڑی معاون ہوتی تھیں، اور اُس کی کتابیں اُس کی تقریروں کے لیے سامعین کا اژدہام لے کر آتی تھیں۔ بحیثیت ناشر عوام النّاس کے ذوق کا اندازہ کرنا وہ اپنے لیے نہایت قابلِ فخر بات سمجھتا تھا، اور یہ اندازہ اِس خوبی سے کرتا تھا کہ ہر کتاب عام لوگوں کے ذوق طلب پر پوری اُترتی تھی۔ بہت سی کتابیں اُس وقت تک شائع نہ ہوتیں جب تک سارے ملک کے ایجنٹ پیشگی اتنی جلدیں نہ بیچ لیتے جس سے کہ کتاب کی اشاعت یقینی طور پر منفعت بخش بن جاتی۔ اُنیسویں صدی کے اواخر میں مقررہ گاہکوں کے ہاتھ بکنے والی کتابیں بڑی ہی دیدہ زیب ہوا کرتی تھیں۔ بالعموم بڑے ہی حسین طریقے سے جلد بندی کر کے اُنہیں تصاویر سے مزیّن کیا جاتا تھا۔ اِس طرح کتاب اِس طرز کی بن جاتی تھی جسے تقریباً ہر شخص اپنی میز پر سجانے میں فخر محسوس کرتا تھا اور بالخصوص اِس وقت جب اُس کے مصنّف کو شہر میں تقریر کئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا ہو یا پھر اس غرض سے وہ وہاں جلد ہی وارد ہونے والا ہو۔

اِن وجوہ کی بنا پر —— اگرچہ محض یہی وجوہات نہیں ہیں۔ مارک ٹوین کی کتابوں نے ہزاروں امریکی گھرانوں میں ترجیحی مقام حاصل کر لیا تھا۔ گذشتہ صدی کے اواخر میں اِس نے اپنی تصانیف کا بائیس جلدوں پر مشتمل ایک آٹوگراف ایڈیشن پیش کیا۔ یہ ہزاروں گھرانوں اور لائبریریوں تک پہنچا —— حتّٰی کہ چھوٹے چھوٹے قصبات اور مضافات کی ان لائبریریوں میں بھی جہاں اسکی خریداری

کی استطاعت نہ تھی یہ ایڈیشن تحفے کے طور پر پہنچ گیا ـــــ خاص طور پر یہ تحفہ اِن گھرانوں سے پہنچا جہاں الماریاں کتابوں سے اَٹا اَٹ بھر گئی تھیں یا اس وقت وہاں یہ بار پا گیا جب چند برسوں کے بعد پچیس جلدوں پر مشتمل انڈر وُڈ ایڈیشن (UNDERWOOD EDITION) نے اِس کی جگہ لے لی۔ ۱۹۱۰ء میں مارک ٹوین کی وفات سے کچھ عرصہ پیشتر اُس کی کتابوں کے قومی ایڈیشن چھپنا شروع ہو گئے تھے۔ بعد ازاں تیسری دہائی میں اُس کی تصنیفات کے جامع و مبسوط ایڈیشن ۳۷ جلدوں میں شائع ہوئے۔ بہت کم مصنّفوں نے اپنی زندگی کے دوران الماریوں میں اس قدر جگہ حاصل کی ہو گی جتنی مارک ٹوین نے حاصل کی ـــــ یہانتک کہ بالزک اور ڈکنز نے بھی شاید ہی یہ مقام پایا ہو۔

مارک ٹوین کے لیے اس قدر کامیابی حاصل کرنا عین مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن سانچوں کو امریکی بالتخصیص اپنے قومی نمونے سمجھتے ہیں اِن میں یہ کامیابی نہایت موزوں اور ٹھیک بیٹھ جاتی ہے۔ مارک ٹوین ایک غریب لڑکا تھا۔ اِس نے اپنی خلقی ہنرمندی سے دولت اور شہرت حاصل کی تھی۔ وہ ڈینیل بون (DANIEL BOONE) اور اینڈریو جیکسن (ANDREW JACKSON) کا ہم سرشت تھا۔ ان دونوں کی طرح اس نے اپنی سرزمین کی اذیتیں برداشت کی تھیں۔ ابراہم لنکن کے لیے ایک چھوٹے سے چوبی مکان سے نکل کر صدارت کے منصب پر فائز ہو جانے نے جو ایک معیار قائم کر دیا تھا، اس کی روایت میں مارک ٹوین نے بھی اپنے کیریئر سے اثباتی اضافہ کیا۔ اس لیے ہاولز اس کو ہمارے ادب کا لنکن قرار دینے میں

حق بجانب تھا۔ اینڈریو کارنیگی کی طرح پہلے پہل اس نے خود بھی محنت میں ہاتھ رنگے تھے، تب کہیں بعد میں جاکر اُسے بڑے مکان اور خدمت گار میسّر آئے تھے۔ ایمرسن نے فرد کی ربّانی کفالت کے بارے میں جو کہا تھا یہ باتیں اُن الفاظ کی صداقت کی توثیق کرتی ہیں۔ یہاں فی الواقع ایک ایسی ہی توانا، اَن پڑھ جمہوری شخصیت تھی جس کا دھیٹمن نے تصوّر دیا تھا۔ مارک ٹوین اگرچہ بادشاہوں اور سرمایہ داروں کے ہمرکاب رہا لیکن اس نے عوام النّاس سے اپنا رابطہ کبھی نہیں توڑا —— ہارٹ فورڈ کے عالیشان مکان، ففتھ ایونیو میں واقع جائے رہائش، یا سٹورم فیلڈ کی دیہاتی اقامت گاہ میں بھی وہ اپنے گذشتہ ایام اور دیرینہ احباب کو یاد کیا کرتا تھا۔!

یہ مقبولِ عام تصوّر اُس کی شخصیت کا نقش تمام تو نہ تھا، تاہم اس کی ذات میں دلکشی برقرار رکھنے کے لیے کافی حد تک موزوں تھا۔ سیموئل لینگ ہارن کلیمنز ۳۰/ نومبر ۱۸۳۵ء کو مسوری کی سرحد پہ چوبی مکانوں والے ایک گاؤں فلوریڈا میں پیدا ہوا جہاں اُس کے والدین ٹینیسی کی پہاڑیوں میں، اپنے آبائی وطن سے نقل مکانی کر کے آبسے تھے۔ اس کا باپ ایک مقامی مجسٹریٹ اور ادنیٰ تاجر تھا، جس کا اصل وطن ورجینیا تھا۔ کینٹکی (KENTUCKY) میں اس نے قانون کی تعلیم حاصل کی تھی۔ یہیں اُس کی ملاقات اور شادی سرخی مائل بھورے بالوں والی لڑکی جین لیمپٹن (JANE LAMPTON) سے ہوئی۔ اس لڑکی کے آباؤ اجداد ان آبادکاروں میں شامل تھے جو ڈینیل بون کے ساتھ پہاڑ عبور کر کے وارد ہوئے تھے۔ مارک ٹوین کا باپ بھی ان ہزاروں امریکیوں میں شامل تھا جو انیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں

میں نو متعارف خطّوں میں طالع آزمائی کی خاطر مغرب کی جانب چلے آئے تھے ۔

لیکن جان مارشل کلیمنز، اِس بستی میں رہتے ہوئے خوشحال نہ ہو سکا جہاں اُس کا تیسرا بیٹا پیدا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس وقت جب سیموئیل کی عمر چار برس تھی، وہ اُس بستی کو خیرباد کہہ کر ہینی بال منتقل ہو گیا جو دریائے مسی سیپی کے کنارے لگ بھگ پانچ سو نفوس پر مشتمل ایک خاصا بڑا قصبہ تھا۔

اِس دریا کے کنارے ـــــ ٹام سائر کی طرح اس کا لڑکپن اس زندگی کے مشاہدے سے سرشار گذرا جو دریا کی میلوں پھیلی ہوئی سطح پر امڈی پڑتی تھی یا جو اس کے ساحلوں پر جائے پناہ اور غذا کی تلاش میں سرگرداں نظر آتی تھی ـــــ روزافزوں وسعت پذیر امریکہ کے وہ پرکشش سیّاح جو بعض اوقات بڑے ہی خطرناک اور جعلساز معلوم ہوتے تھے اِس سرحدی علاقے سے گذرا کرتے تھے۔ وہ کبھی دریا کی ایک سمت جاتے اور کبھی دوسری سمت یا پھر دریا کو عبور کر کے مغربی میدانوں کی جانب جا نکلتے تھے۔ سیموئیل نے ان مناظر کا اپنے لڑکپن میں اِسی طرح مشاہدہ کیا ہوگا جس طرح کوئی بھی لڑکا تحیّر کے ساتھ، لیکن جذبۂ خوف لیے ہوئے کر سکتا ہے۔ اس نے لوگوں کو دریا پر دھینگا مشتی کرتے اور اس کے نتیجے میں اپاہج بنتے یا قتل ہوتے دیکھا تھا۔ اِس نے جانوروں کی مانند زنجیروں میں جکڑے ہوئے ان حبشیوں کو بھی دیکھا تھا جنہیں غلاموں کی زیادہ منفعت بخش جنوبی منڈیوں میں لے جایا جاتا تھا۔ وہ راتوں کو ڈراؤنے خواب دیکھا کرتا اور نیند کی حالت میں چلا کرتا تھا۔ وہ اِن باتوں کو، اجڈ طور طریقوں، وحشت ناک گفتگو اور اِس دہشت زدگی کو ہمیشہ یاد کیا کرتا تھا۔

THE SQUATTER "کارپیٹ بیگ" (CARPET-BAG) میں شائع ہوئی۔ یہ بوسٹن سے شائع ہونے والا کھلاڑیوں کا ایک رسالہ تھا۔ کہانی پر ایس۔ ایل۔ سی ("S.L.C") کے دستخط ثبت تھے۔ یہ کہانی بھانڈوں کے "نمائشی ڈرّے" والے مقامی مزاح کی روایت میں لکھی گئی تھی —— یعنی اس پیرائے میں جیسی کہ اس زمانے میں کہانیاں لکھی جا رہی تھیں یا سام سلک (SAM SLICK)، آرفیوس۔سی۔کر (ORPHEUS C.KERR) اور آرٹیمس وارڈ (ARTEMUS WARD) جیسے فرضی ناموں والے پسندیدہ ادیبوں کے قلم سے جلد ہی احاطہ، تحریر میں آنے والی تھیں۔ یہ کہانی مارک ٹوین کے اس اندازِ نگارش کی پیش گوئی کہی جا سکتی ہے، جسے اس نے بعد میں اختیار کیا۔ یہ کہانی سرحدی لوگوں کی مختصر اور پر مغز گفتگو اور مغربی کہانیوں کے مبالغہ آمیز ضائع و بدائع سے پُر ہے۔ طنز و تضحیک نے اسے خاصا چٹپٹا بنا دیا ہے، اور یہ انداز بالواسطہ طور پر ڈکنز سے سیکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کہانی کا پس منظر دریائے مسی سیپی کے کنارے ہینی بال قصبہ ہے۔ اس کے لب و لہجے اور زبان کا جب اسی سال شائع ہونے والی کہانیوں —— نیتھنیل ہاتھورن (NATHANIEL HAWTHORNE) کی (THE BLITHEDALE ROMANCE) اور ہرمن میلول کی "پائری" (PIERRE) سے موازنہ کیا جاتا ہے تو کچھ ایسی باتوں کے اشارے ملتے ہیں جو ان دنوں ریاست ہائے متحدہ کی تحریروں میں، بہتر یا بدتر طور پر، داخل ہو رہی تھیں یا ہونے والی تھیں۔

لیکن سیاحت کا بھوت جلد ہی نوجوان سیموئل کلیمنز پر سوار ہو گیا۔ وہ اب حقیقتاً

جہاں گشت بن گیا اور اٹھارہ برس کی عمر میں وہ ہینی بال کو الوداع کہہ کر سینٹ لوئی چلا گیا۔ یہ موری کا سب سے بڑا شہر ہے۔ یہاں وہ اپنی آمدنی سے کچھ پس انداز کرنے لگا۔ جب اس کی جیب میں کچھ پیسے ہو گئے۔ تو ایک دن وہ اپنی اس مغربی ریاست کی حدود کو بھی پار کر گیا۔ دراصل وہ اِس بات کا پتہ لگانا چاہتا تھا کہ آیا اطرافِ مشرق کے بڑے شہروں میں ایک نوجوان آدمی نسبتاً" جلد دولت مند بن سکتا ہے یا نہیں۔؟ اِس تجسّس کے تحت پہلے اس نے شکاگو اور بوفیلو کے راستے، نیویارک تک، دخانی کشتی اور ریل کے ذریعے سفر کیا۔ نیویارک پہنچ کر تھوڑے دنوں تک اس نے جاب پرنٹر کا کام کیا، پھر وہ بحیثیت کمپوزیٹر قسمت آزمائی کے لیے پہلے فلاڈلفیا، اس کے بعد واشنگٹن جا پہنچا۔ کچھ دنوں بعد واشنگٹن سے دوبارہ فلاڈلفیا چلا گیا۔ تھوڑے عرصے کے بعد وہ پھر سفر پر نکل کھڑا ہوا۔ اِس بار وہ مس کیٹائن (MUSCATINE) کے مغرب میں آئیووا، اِس غرض سے پہنچا کہ ٹائپ لگانے میں اپنے اُس بھائی کا ہاتھ بٹا سکے جس کا ایک پیر اس کی طرح ہمیشہ گردش میں رہتا تھا۔ تاہم وہاں سے وہ جلد ہی سینٹ لوئی واپس آگیا، اس کے بعد ایک بار پھر وہ ریاست آئیووا کے مقام کیوکک میں، اپنے بھائی کے پاس آیا۔ اس مرتبہ اِس نے پورے دو سال تک یہاں قیام کیا۔!

لیکن ایک جہاں گرد کے لیے دو سال تک ایک ہی مقام پر جمے رہنا بہرحال ایک طویل عرصہ تھا —— پھر اِس حالت میں جبکہ یہاں وہ دولت بھی جمع نہیں کر رہا تھا۔! چنانچہ اس نے ۵۷-۱۸۵۶ء کا موسم سرما سن سِناٹی میں گذارا۔ لیکن اِس کے لیے یہاں کا قیام تو بس راستے کے ایک پڑاؤ کی طرح تھا۔ اِس کے دماغ

میں تو یہ خیال سمایا ہوا تھا کہ بائیس برس کا ایک نوجوان جنوبی امریکہ میں دریائے ایمیزن کے سرسبز و شاداب ساحلوں پر حصولِ دولت کے مواقع دریافت کرنے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ کر سکتا ہے۔ اپنے لیے وہاں تفریح و دلبستگی کے سامان بھی مہیا کر سکتا ہے۔ لہٰذا اپریل ۱۸۵۷ء میں (یہ تاریخ اُس کی زندگی میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے) وہ مسی سیپی کے بہاؤ کی طرف نیو آرلینز روانہ ہوا۔ شہرت کی جانب یہ اس کا پہلا قدم تھا۔ پھر کیا ہوا؟ اُس کی ملاقات دخانی کشتی کے آزمودہ ملاح ہوریس بکسبی (HORACE BIXBY) سے ہوتی ہے۔

یہ وہ ایام ہیں جب وہ کشتی چلانے کی تربیت حاصل کرتا ہے اور دریائے مسی سیپی پر چار سال گذارتا ہے۔ اِن ایام کا لوگوں نے اکثر ذکر کیا ہے لیکن اِس زمانے کی تصویر کشی کلیمنز سے بہتر آج تک کسی نے بھی نہیں کی۔ وہ اِن دنوں کو یاد کر کے اِن میں ایک ایسی رومانی فضا بھر دیتا تھا جس سے اس کی جزئیاتِ حقیقت اور بھی زیادہ دلکش اور مؤثر بن جاتی تھیں۔

لیکن اس کا جنوبی امریکہ کا نامکمل سفر اور بھی کچھ وجوہ کی بنا پر یاد کیا جاتا ہے۔ یہیں سیموئل کلیمنز نے وہ پیشہ درانہ کام اختیار کیا تھا جو بعد میں اس کے لیے عالمگیر شہرت و تحسین کا باعث بنا۔ اس کی مسلسل سیر و سیاحت کی دیرینہ خواہش کو جن تحریروں نے ممکن اور منفعت بخش بنایا تھا ان کا پہلا نمونہ اِس نے کیوکک (KEOKUK) میں ہی تیار کیا تھا۔ "ایوننگ پوسٹ" کے مدیر سے اس کی یہ بات طے ہو گئی کہ جہاں گشت سیموئل کلیمنز اپنی سیر و سیاحت کے مشاہدات اور سرگرمیوں کی رپورٹ حتی الامکان پابندی کے ساتھ اخبار کو مہیا کرتا رہے گا۔ اس سلسلے میں اس کے صرف تین مضامین

شائع ہو سکے۔ وجہ شاید یہ تھی کہ وہ دخانی جہاز کو چلانے کے نسبتاً زیادہ پر جوش کام کو سیکھنے میں مستغرق رہتا تھا۔ اِن مضامین پر "طامس جیفرسن سناڈ گراس (THOMAS JEFFERSON SNODGRASS) کے دستخط ثبت تھے اور یہ کمال شدت اور خود آگاہی کے حامل مزاحیہ مضامین تھے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے کسی دوسرے سیاح صحافی کی تحریروں اور ان مضامین کے مابین مشکل ہی سے امتیاز کیا جا سکتا تھا۔ سناڈ گراس ایک ایسا نام تھا جو کلیمنز کو ہمیشہ بے حد مضحک معلوم ہوتا تھا۔ کیلیفورنیا کی تحریروں میں بھی اِس نے یہی نام استعمال کیا تھا۔ تیس برس کے بعد جب اِس نے ایک کہانی "امریکی دعویدار" (THE AMERICAN CLAIMANT) لکھی، اِس میں بھی اس نے دو کردار "زائی لوبل سیم سناڈ گراس (ZYLOBALSAMUM SNODGRASS) اور "سپائی نل مینن گیٹس سناڈ گراس" (SPINAL MENINGITIS SNODGRASS) پیش کئے۔ کہانی "ٹام سائر بیرون ملک میں"، بھی وہ مشہور مصنف "سناڈ گراس" کا ذکر کرتا ہے۔ ۱۸۵۷ء اور ۱۸۶۱ء کے درمیانی وقفے میں جب وہ دریائے مسی سپی پر دخانی کشتی چلایا کرتا تھا اور ۱۸۵۹ء کے موسم بہار میں جب وہ ایک باقاعدہ لائسنس یافتہ ملاّح بن چکا تھا، ان دنوں میں بھی نیو آرلینز کے اخبار "ڈیلی کرسینٹ" میں وہ کوئن ٹیس کرٹیس سناڈ گراس (QUINTIUS CURTIUS SNODGRASS) کے نام سے خطوط لکھا کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اِس زمانے میں عیسوی عقیدے سے متعلق ایک دریائی داستان کی اِس نے ایک مزاحیہ نقل لکھ ڈالی تھی۔ یہ داستان دخانی کشتی کے ایک ریٹائرڈ کپتان عیسیٰ سیلرز نامی شخص نے نیو آرلینز کے

ایک اخبار میں "مارک ٹوین" کے نام سے چھپوائی تھی - اس ضمن میں ایک نہایت پسندیدہ لیکن ضعیف روایت راہ پاگئی ہے۔ کہتے ہیں کہ اِس تضحیک سے کپتان سیلرز کی اِس درجہ دل شکنی ہوئی تھی کہ خود سیموئل کلیمنز کے ضمیر میں اس کی چبھن پیدا ہو گئی تھی۔ نتیجتاً چند برس بعد، اِس نوجوان (سیموئل کلیمنز) نے بوڑھے کپتان کا فرضی نام خود اپنے لیے اختیار کرلیا اور یہ نام، جیساکہ ہر فرد و بشر جانتا ہے، "آب شناس" (تھاہ معلوم کرنے والا) کی اِس صدا کو کہتے ہیں جو وہ کشتی کے ناخدا کو سناتے ہوئے، اس وقت لگاتا ہے جبکہ پانی بظاہر تو محفوظ نظر آتا ہے لیکن کشتی کے آگے موجزن ہوتا ہے۔

۱۸۶۱ء میں جب خانہ جنگی مسی سیپی تک آگئی اور شمال سے جنوب اور جنوب سے شمال کا دریائی سفر ممکن نہ رہا، اِس وقت دخانی کشتی چلانے کا منفعت بخش کاروبار بھی ختم ہوکر رہ گیا۔ چنانچہ اب کلیمنز بیکار ہوگیا۔ ریاستوں کے مابین خانہ جنگی میں اس نے محض برائے نام ہی حصہ لیا۔ ایک غیر معتبر روایت کے مطابق اس خانہ جنگی میں اُسے اطرافِ دریا کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ نیو آرلینز سے لکھے ہوئے، سناڈ گراس کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اِس شہر میں ملیشیا کی قواعد پریڈ سے بھی کچھ تعلق رکھتا تھا۔ بعد ازاں مارک ٹوین نے ماہنامہ "اٹلانٹک" میں ایک مزاحیہ مضمون "ایک مہم کی نجی کہانی جو کامیاب نہ ہو سکی" لکھ کر قارئین کو محظوظ بھی کیا تھا۔ یہ کہانی پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح اس نے اور اس کے ساتھیوں نے خود کو ایک بے قاعدہ فوجی دستے میں تربیت دے کر کنفڈریٹ فوج سے منسلک ہونے کی سعیٔ لاحاصل کی تھی۔ اِس ضمن میں، جنوب کی باغی افواج

کے شانہ بشانہ اُس کی خدمات صرف ایک مختصر وقفے تک محدود تھیں۔ اس اتفاق کی بابت، یہ تصور کیا جاتا ہے کہ بعد ازاں شمال پسند مارک ٹوین گفتگو کرتے ہوئے نہایت احتیاط برتتا تھا۔

۱۸۶۱ء کے موسم بہار میں کلیمنز اپنے بھائی اورین کے ساتھ مغرب کے دور دراز علاقوں تک گیا۔ اس کے بھائی نے ابراہم لنکن کی صدارتی مہم میں سرگرم حصہ لیا تھا۔ اس کے صلے میں اُسے نئے مقبوضہ علاقے نویدا کا سکریٹری بنا دیا گیا۔ اورین کلیمنز جس نے کبھی کسی پیشے میں نمایاں کامیابی حاصل نہیں کی تھی۔ ایک تنگ دست انسان تھا۔ اسی لیے اس کے بھائی سمیوئل نے جو بحیثیت ملاّح خاصی رقم کما چکا تھا اپنے اور اپنے بھائی کے سفر خرچ کی کفالت کی اور خود علاقے کے نئے سکریٹری کا معتمدِ اعزازی بن کر سفر میں ساتھ رہا۔ میدانوں کے اس پار کی مسافرت اور کارسن شہر کے تجربات کی داستان بعد ازاں ایک کہانی "ROUGHING-IT" میں بیان ہوئی ہے۔ اس میں، جیسا کہ ہُک فن نے ایک موقعہ پر اُس کے متعلق رائے دی تھی کہ ——— مارک ٹوین نے ہی "خاص طور پر سچّی باتیں کہی ہیں"، ——— جھیل تاہُو کے نزدیک عمارتی لکڑی کے غیر یقینی کاروبار میں اس کی مہمات کا حال معلوم ہوتا ہے۔ کسی کو نگرانی پر مامور کئے بغیر، کمال لاپرواہی سے خیمے میں جلتی آگ چھوڑ جانے کے نتیجے میں بیشتر جنگل شعلوں کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس تحریر میں وہ اس سرمایے کا ذکر کرتا ہے جو اس نے چاندی کی کانوں میں لگایا تھا، کیونکہ اورین اور وہ دونوں حصول زر کی انتہائی خواہش میں مبتلا تھے۔ ایک بار ایک قیمتی کان پا لینے

کے بعد وہ دس دن کے لیے لکھ پتی بھی بن جاتا ہے لیکن اس کی لاپرواہی سے یہ کان بھی اس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ نویدا میں سیموئل کلیمنز سے متعلق طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہیں۔ عوام الناس میں مارک ٹوین کی شخصیت کا ہیولا بیشتر طور پر ان کہانیوں پر مبنی ہے جو متنوع انداز میں خود اس کی یا اس کے واقف کار افراد کی بیان کردہ ہیں۔ وہ ایک ڈھیلا ڈھالا، بے ہنگم چال اور الجھے بالوں والا ایسا انسان متصوّر ہوتا ہے جو سرحدی قصبے میں آستینوں والی قمیض اور کارڈرائی کی پتلون پہنے، یا تو کہانیاں سناتا پھرتا تھا یا لوگوں کو باتیں کرتے سنا کرتا تھا۔ یہ بات بھی ہمیں بتائی جاتی ہے کہ وہ سٹے یا داؤں لگانے کے کاموں میں بھی بڑا مستعد رہا کرتا تھا۔

نویدا میں ابھی ایک برس بھی نہ گزرا تھا کہ صحافت کا پرانا پیشہ ایک بار پھر اس نے اختیار کر لیا۔ ورجینیا شہر کے پرچے "ٹیرٹیوریل انٹرپرائز" میں وہ قلمی نام "جوش" سے مزاحیہ اور طنزیہ خاکے لکھنے لگا۔ وہاں اسٹیو گیلس (STEVE GILLIS) جیسے جوشیلے دوستوں کے ساتھ وہ آزادانہ زندگی گزارتا تھا۔ گیلس ایک پرنٹر تھا جس کا گاہ بگاہ فرار دونوں ہی کے لیے پریشانی کا باعث بن جاتا تھا۔ اِس مشہور سرحدی اخبار کی بے باکی نے کلیمنز کو "متحیر انسان" اور "ڈیچ نک کا قتل عام" جیسی مغالطہ آمیز صحافتی کہانیاں لکھنے پر آمادہ کیا۔ جب مشرقی اخبارات نے انہیں سچی کہانیاں سمجھ کر اپنے کالموں میں نقل کیا تو اُسے یہ جان کر بے پایاں مسرّت ہوئی۔ یہاں پہلی بار آرٹیمس وارڈ سے اُس کی ملاقات ہوئی۔ اِس مقبول عام مزاح نگار کی معیت میں اِس نے پُرلطف

شامیں گذاریں۔ وارڈ نے اسے وہ گُر بتلایا جس سے کہ مارک ٹوین (کلیمنز اب اپنی تحریریں اس نام سے ہی پیش کر رہا تھا) اپنی شہرت میں مزید اضافہ کر سکتا تھا۔ واشو جائنٹ (WASHOE GIANT) کے نام سے وہ پہلے ہی معروفِ عام تھا اور سیج برش ہلز کے بیباک مزاح نگار کی حیثیت سے تو اس کی شہرت کیلی فورنیا تک پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن اُس کے (سیموئل کلیمنز کے) دل میں تو دراصل کچھ اور ہی تمنائیں کروٹیں لے رہی تھیں۔!

ان دنوں اِس نے ایک حریف صحافی کو ڈوئیل کے لیے چیلنج کیا۔ یہ چیلنج ڈوئیل کے امتناعی قانون کی صریح خلاف ورزی تھا۔ چنانچہ وہ اور اُس کا وفادار دوست گیلس ۱۸۶۴ء کے موسم بہار میں کیلی فورنیا کھسک گئے، جہاں ان کے اور نویدا کے قید خانوں کے درمیان پہاڑی سلسلے کھڑے تھے۔ ایک مختصر سی مدت کے لیے اِس نے (کلیمنز نے) سان فرانسسکو کے اخبار "کال" میں بحیثیت رپورٹر کام کیا، لیکن اس کے لیے یہ ایک خوفناک مشقت تھی۔ اس بارے میں وہ خود کہتا ہے کہ "ایک کاہل کے لیے تو یہ ایک اندوہناک غلامی تھی"، چنانچہ مستقل ملازمت چھوڑ کر "فری لانسر"، کی حیثیت سے وہ "گولڈن ایرا" اور بریٹ ہارٹی کے اخبار "کیلی فورنین"، میں لکھنے لگا۔ ساتھ ہی ورجینیا سے شائع ہونے والے اپنے سابقہ اخبار کے لیے سان فرانسسکو کا نامہ نگار بن گیا۔ یہاں تک کہ ایک بار پھر وہ بے سوچے سمجھے اس وقت قانون سے الجھ پڑا، جب گیلس بار روم میں فساد کرنے پر گرفتار ہو گیا تھا۔ اور بعد ازاں کلیمنز کی فراہم کردہ ضمانت پر ہی اُسے رہا کیا گیا۔ گیلس ایک نہایت پُرفن اور چالاک آدمی تھا، چنانچہ جب

وہ پہاڑوں کو عبور کر کے نو یدا فرار ہو گیا تب اس کے ضامن نے بھی وہاں سے جلد از جلد چمپت ہو جانے ہی میں اپنی خیر دیکھی۔

اِس بار وہ سائی رانز کی طرف بھاگا۔ یہاں اِس نے سیٹو گیلس کے بھائی جم کے ساتھ جیکس ہل پر قیام کیا۔ جم ایک مشاق داستان گو تھا۔ اسے بعد ازاں بریٹ ہارٹی کے "سچے جیمز" کی حیثیت سے شہرت ملی۔ یہاں اینجلز کیمپ میں اُس نے بوڑھے راس کون کی زبانی "کلیویراس" قصبے کے اچھلنے کودنے والے مشہور مینڈک کا قصہ سنا، جس کو اِس نے اِسی زبان اور لب و لہجے میں "اندرون جنگل کی بدقماشی پر مبنی ایک اسکیچ" کی صورت میں لکھ ڈالا۔ آرٹیمس وارڈ مشرق کی کہانیوں کا ایک مجموعہ شائع کر رہا تھا، چنانچہ اس نے کلیمنز سے بھی ایک کہانی لکھنے کا مطالبہ کیا۔ کلیمنز نے اپنا یہی اسکیچ مجموعے کے لیے بھیج دیا۔ لیکن یہ ایک مبارک حادثہ تھا کہ وہ اسکیچ وارڈ کے پاس کافی تاخیر سے پہنچا۔ یہ اس کے مجموعے میں تو شامل نہ ہو سکا البتہ نیویارک کے "ایوننگ پوسٹ" نے کسی طرح اسے اچک لیا۔ "ایوننگ پوسٹ" میں چھپتے ہی اسکیچ کی دھوم مچ گئی۔ ملک کے تمام اخبارات نے اسے نقل کیا۔ یہاں تک کہ کیلی فورنیا میں بھی مشرقی ادیب کا ایک شاہکار سمجھ کر اسے نہایت اعزاز کے ساتھ چھاپا گیا۔ یوں تو کلیمنز کے لیے اس کی اشاعت نہایت سود مند ثابت ہوئی تاہم اپنی اِس شہرت سے اس نے کچھ حاصل نہ کیا۔

اسی زمانے میں ۱۸۶۵ء کا ذکر ہے کہ "پیسی فک سٹیم بوٹ کمپنی" نے سان فرانسسکو اور ہونولولو کے درمیان دخانی جہاز کی باقاعدہ سروس شروع

کر دی۔ کلیمنز نے اِسی سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سفر کر ڈالا۔ اخراجات سفر وہ سیکرامینٹو یونین (SACRAMENTO UNION) میں خطوط لکھ کر پورے کرتا رہا۔ چار برس بعد "ممالک غیر میں سادہ لوح افراد" (INNOCENTS ABROAD) کے عنوان سے جو کتاب اس کے لیے شہرت کا باعث بنی، اِس کے تار و پود آخری شکل میں اِسی زمانے ہی میں مرتب ہوئے تھے۔ یہ سینڈوچ آئی لینڈ لیٹرز (SANDWICH ISLAND LETTERS) افراط و تفریط سے پر ہونے کے علاوہ بعض اوقات نہایت عامیانہ بھی نظر آتے ہیں۔ اس سفر میں اس کے ساتھ ایک ایسا خیالی ہمسفر بھی تھا جس پر قابو پانا آسان نہ تھا۔ اس کا نام براؤن تھا، جو ڈینگ مارتے ہوئے کہتا تھا کہ اس کی محبوبہ اتنی نفاست پسند ہے کہ اپنی ناک تک دو شاخے سے چھوتی ہے۔ جہاز پر جب لوگ گھومنی میں مبتلا ہوئے تو "براؤن وہاں موجود تھا۔ وہ ایک دردمند انسان کی طرح ہر مسافر کو تسلیاں دیتا پھرتا ——— "گھبرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ اندر کا کاٹھ کباڑ اس طرح خارج کر دے گا جیسے کسی چیز کو ہلا ہلا کر صاف کیا جاتا ہے۔ پھر آپ نہ تو ہول محسوس کریں گے اور نہ ایسی بے ہودہ بُو سونگھیں گے"۔

مارک ٹوین بحرالکاہل کے اِن دلکش جزیروں کو پسند کرتا تھا۔ اِس نے لکھا تھا "میں غروب آفتاب کے وقت، سان فرانسسکو پولیس کے قدیم عدالتی کمرے کے بمقابلہ ہونولولو کی فضا میں سانس لینا زیادہ پسند کرتا ہوں"۔ وہ جزیرے کے اِن باشندوں کو پسندیدگی سے دیکھتا تھا جو ہمیشہ اپنی رانوں پر چوکڑی مار

کر بیٹھتے ہیں،، اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہی اولین "ہیم سینڈوچز" ہوں۔ وہ ان کی رسمیں بھی پسند کرتا تھا، خاص طور پر "ہولا ہولا کی مخربّ اخلاق رسم"، جس کی صرف ایک صورت میں اجازت تھی، وہ یہ کہ "رات کے وقت جبکہ دروازے بند ہوں، ارباب اختیار کی اجازت حاصل ہو اور اس کے لیے دس ڈالر بھی ادا کر دئے گئے ہوں!" ورنہ بالعموم وہاں اس کی ممانعت تھی۔ جزیرے کے حسن اور اس کی رعنائیوں کے بارے میں بعض اوقات وہ نہایت جذباتی ہو جاتا تھا۔ تاہم اِس موقع پر براؤن اسے جھنجھوڑ کر یاد دلاتا تھا کہ ہونولولو میں "جتنے کنکھجورے، بچھّو، مکڑے، مچھّر اور مشنری لوگ ہیں،" دنیا میں شاید ہی کہیں اور ہوں۔

کلیمنز نے اپنے لیے اب ایک ایسا کام دریافت کر لیا تھا جو اس کی افتاد طبع کے لحاظ سے نہایت موزوں تھا۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق گھوم پھر سکتا تھا اور اپنے اخراجات سفر معلوماتی اور مزاحیہ مضامین لکھ کر پورے کر سکتا تھا۔ دسمبر ۱۸۶۶ء میں اس نے مغرب کے ممتاز ترین اخبار "ایلٹا کیلی فورنین" کے ساتھ ایک "سیّاح نامہ نگار" کی حیثیت سے معاہدہ کر لیا۔ اِس میں وقت، مقام اور سمت کی کوئی قید نہ تھی۔ اس کی رو سے اگر وہ چاہتا تو دنیا کا سفر کر سکتا تھا اور جہاں سے جی چاہتا خطوط لکھ سکتا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے پہلا قدم نیویارک کی طرف بڑھایا اور کشتی کے ذریعے سیر سپاٹے کرتا اس شہر میں جا وارد ہوا۔ اس کے ہمراہ اس کا پُرجوش ساتھی براؤن بھی تھا۔ اس زمانے میں اس نے جو خطوط لکھے ہیں وہ سابقہ خطوط کی نسبت زیادہ جاندار اور چٹکیلے ہیں۔ تاہم اِس میں بعد ازاں لکھے جانے والے سفر ناموں جیسا رکھ رکھاؤ نہیں

ہے۔ ان خطوط میں وہ ایک زندہ دل کپتان ویکمین کو پیش کرتا ہے۔ اس کپتان کی مشیخت آمیز کہانیاں، اس کا کفر و الحاد اور انجیل کی داستانیں ایک بار پھر ROUGHING IT میں کپتان بلیک لی (CAPTAIN BLAKELY) کی ذات میں زندگی پاتی ہیں۔ تیسری بار وہ کپتان سمتھ فیلڈ میں منعکس ہوتی ہیں، جس نے جنّت کا سفر کیا تھا۔ اس مفرور جوڑے کے تذکرے میں بڑی ہی جذباتیت ہے جس نے سمندر پر جا کر اپنی شادی رچائی تھی اور گھومنی میں مبتلا مسافروں کے ساتھ مسٹر براؤن کے غیر شائستہ اظہار ہمدردی میں بھانڈوں کی نمائشی ورّے والی تکنیک کی بھرمار ہے۔ تاہم وہاں جذبۂ ترحم بھی موجود ہے کیونکہ مارک ٹوین نکاراگوآ، میں ہیضے کی بپتا کا تذکرہ کرتا ہے اور غصّے کا اظہار بھی، کیونکہ آتش زیر پا اہلِ فلوریڈا کو دیکھ کر وہ غرّاتا بھی ہے۔!

نیو یارک پہنچنے پر اس کے خطوط میں نئی قوت اور تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ خطوط بزرگ تر مارک ٹوین کی خصوصیات کے مظہر ہیں۔ تیرہ برس بیشتر جب وہ ایک نوخیز اور معصوم لڑکا تھا تو یہاں آ گیا تھا۔ لیکن اب اس وسیع و عریض دار الخلافے میں بڑے تغیرات واقع ہو چکے تھے۔ اب وہ اس شہر کے ان "انسانی دڑبوں" کی غلاظت کو غم و غصّے سے دیکھتا تھا جن میں مفلس و قلاش لوگ جرم و بدی کی زندگی گذارتے تھے اور جو اپنے پڑوس کے نیک، دردمند موٹے تازے اور فراخ دل لوگوں کا نشانۂ ستم تھے۔ اس کی معاشرتی چھان بین انتہا پر اس وقت پہنچی جب مفسدانہ چلن کی بنا پر اُسے گرفتار کر لیا گیا اور ایک رات اسے قید خانے میں کاٹنی پڑی۔ وہاں اُسے ایسے آوارہ گرد

افراد، طوائفیں اور سابق فوجی ملے جو مہروں کی طرح معاشرتی ضبط و اوہام کے رحم و کرم پر جی رہے تھے، اور جن کی حالت زار کے پیش نظر، ان سے گفتگو کرتے ہوئے وہ نہایت پیچ و تاب کھاتا تھا۔ پوری نسل انسانی کو ملعون قرار دینے والی قنوطیت کے آثار تلاش کرنے کے لیے ضروری نہیں کہ ہم اس مارک ٹوین کو دیکھیں جو اپنی زندگی کے اواخر میں نظر آتا ہے۔ یہ رجحان تو تیس برس کی عمر ہی میں اس کی شخصیت کا ایک ٹھوس حصہ بن گیا تھا۔!

نیو یارک میں اس کی پہلی تصنیف زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔ اس کتاب کا نام تھا "کیلیویراس علاقے کا اچھلنے والا معروف زمانہ مینڈک اور دوسرے خاکے"۔ اب اس نے گھومنے پھرنے کا پھر سے آغاز کیا۔ دنیا کے گرد "چکر" لگانا اس کا مقصد نہیں تھا، بلکہ وہ "کویکرسٹی" نامی جہاز پر بحرِ روم اور مشرق قریب کے تفریحی سفر پر جانا چاہتا تھا۔ اس سفر سے اس نے جو خطوط کیلی فورنیا کے اخبار، نیز نیو یارک میں ہوریس گریلی کے اخبار "ٹریبیون"، کو ارسال کئے وہ ان لوگوں تک پہنچے جو پہلے ہی کلیمنز کے اِس پُر اعتماد مفروضے کو قبول کرنے کے لیے تیار تھے کہ پرانی دنیا کے متعدد مقاماتِ مقدسہ امریکی معیاروں پر پورے نہیں اترتے۔ اس نے جو کچھ لکھا تھا عوام الناس پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ چند ماہ بعد جب وہ واپس نیو یارک پہنچا تو مغربی میدانوں کے اس جنگلی گھوڑے (مارک ٹوین) نے خود کو میدانِ ادب کا شیر پایا اور اب رسائل، اخبارات، تقاریر سننے والے اور ناشرین اس کے لیے سرگرداں رہا کرتے تھے۔

جب شہرت و مقبولیت نے اس کے قدم چومے تو سیموئل کلیمنز، اس لمحے سے آنے والے دنوں تک، یکے بعد دیگرے، کامیابیوں سے ہی ہمکنار ہوتا رہا۔ اسے کامیابی اور خوشحالی چاندی (کی کانوں) سے، جیسا کہ اس نے کبھی خواب دیکھا تھا، تو حاصل نہ ہو سکی البتہ اپنے خوش طبع ہم زاد کو کتابوں کے قالب میں بھیج کر یا پلیٹ فارم پر سے تقریریں کر کے وہ خوش بختی کے دور سے ضرور ہمکنار ہو گیا۔ اس کی ملاقات نیویارک کے ایک دولت مند صنعت کار کی بیٹی اولیوا لینگڈن سے ہوئی جس سے طویل کورٹ شپ کے بعد اس نے شادی کر لی۔ اپنے ہونے والے خسر کی عطا کردہ رقم سے بفیلو کے ایک اخبار میں اس نے ایک حصّہ خرید لیا۔ اس جہاں گشت (مارک ٹوین) نے بحیثیت مدیر تو استحکام حاصل نہیں کیا، کیونکہ اس پیشے سے جلد ہی اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ البتہ کتابوں کی رائلٹی اور تقاریر کی فیس سے ہرٹ فورڈ میں اس نے ایک شاندار مکان ضرور تعمیر کر ڈالا۔ اپنی زندگی میں اس نے یہی استحکام پایا۔ اس کے علاوہ وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا، کیونکہ وہ سرتاپا، خود اپنے الفاظ میں، "ادب اور اس نوع کی خرافات میں پھنسا ہوا تھا"!

۱۸۶۹ء میں کو ٹیگر سٹی کے خطوط پر نظر ثانی کے بعد (مثال کے طور پر اس میں سے مسٹر براؤن کی دل آزار رائے زنی خارج کر دی گئی تھی) جب اس کی کتاب "ممالک غیر میں معصوم افراد" یا دی نیو پلگرمس پروگریس" (THE NEW PILGRIM'S PROGRESS) شائع ہوئی تو تبصرہ نگاروں نے اس کتاب کو "شمپین کے ایک جام کی طرح تازہ ذائقہ دار ضیا بار" پایا۔ اس

میں طنز نہایت چاق و چوبند اور ذکاوت و سوفسطائیت سے بھرپور ہے، مزاح ایسا کہ ہنساتے ہنساتے پیٹ میں بل ڈال دیتا ہے، لب ولہجہ مغربی مزاح کا ہے، لیکن موضوع گذشتہ صدی کی روشن خیالی کے زمانے سے نیک طینت لوگوں کا پسندیدہ مبحث تھا۔ بحر اوقیانوس کے اس پار جو ادارے تھے، اس میں ان کے انحطاط اور ناکارہ پن کے تذکرے کے پہلو بہ پہلو نئی دنیا (امریکہ) کی قوت بخش تازگی کا حال بھی موجود تھا۔ سفر کرتے ہوئے امریکی سادہ لوح انسان مقامی بازاروں میں مول تول کرتے پھرتے تھے۔ یہ سوچ کر خوش ہوتے تھے کہ ان کی اپنی زبان کے علاوہ ہر زبان مضحکہ خیز ہے اور ساتھ ہی اپنے اجنبی پن کا انہیں مطلق احساس نہ ہوتا تھا۔ وینس ایک عظیم الشان شہر تھا۔ اگرچہ اس کے ملاّح دلفریب حد تک اُول جلوُل تھے، مگر فلورنس میں دریائے ارنو کے ساحلوں پر میڈیسی خاندان کی خونریزیوں سے ارنو سنولا گیا تھا۔ وہ مقدس سرزمین گرم اور گندی تھی۔ وہاں فقیر اور اس قماش کے لوگ بڑی تعداد میں تھے جو بظاہر ترجمان اور بباطن رہزن تھے۔ گیلیلی میں جب ایک ملاّح نے ایک زائر سے معمول سے زیادہ کرایہ طلب کیا تو اِس نے فقرہ چست کیا کہ "یہ کوئی حیران کن بات نہیں کہ حضرت عیسےٰؑ پیدل سفر کیا کرتے تھے"، یا تو کلیمنز خود ایک چالاک آدمی تھا یا پھر چونکہ وہ اپنی تربیت کے لحاظ سے ان جیسا تھا، لہٰذا اس نے اپنی تحریروں میں اپنے بہت سے ہم وطنوں کے رجحانات کا ہی اظہار کیا ہے، حتیٰ کہ اس نے ان کے اس رجحان تک کو قبول کیا ہے جس کی رو سے اصل شاہکاروں پر ان کی نقول کو مقابلتاً زیادہ تابناک سمجھ کر ترجیح دی جاتی تھی۔

اکثر قارئین کے لیے "ممالک غیر میں معصوم افراد" کلیمنز کی دوسری بہترین کتاب کا درجہ رکھتی ہے یعنی "ہکل بیری فن کی مہمات" کے بعد اسی کتاب سے وہ رغبت محسوس کرتے ہیں۔ البتہ "مسی سیپی میں زندگی" سے کچھ زیادہ اس کے برابر دلچسپی وہ اِس کتاب میں ضرور لیتے ہیں۔ ہنری جیمز کی پیش بینی کرتے ہوئے گویا یہ کتاب امریکنوں کی حیثیت نیز بحر اوقیانوس کے پرے آباد دنیا کو اس کی ضروریات کے پس منظر میں نئے سرے سے دیکھتی ہے۔ اگرچہ اس میں جیمز جیسی دقت پسندی، باشعور فن اور گہرائی و گیرائی نہیں ملتی لیکن اس حقیقت کے باوجود یہ ہر دو اطراف کی کمزوریوں کی ضرور نشان دہی کر دیتی ہے۔ اس طرح یہ ایک ایسی کتاب بن جاتی ہے جسے کٹر وطن پرست اور وسیع المشرب اصحاب دونوں ہی مساوی طور پر سراہتے ہیں۔ نہایت لاپروائی سے لکھے ہوئے ابتدا کے مکاتیب سفر میں جو غیر متوازن اور بے تدبیر کھردرا پن ملتا ہے اسے کتاب مذکور سے خارج کر دیا گیا ہے، لیکن دھیان رہے کہ اس نے یہ قطع و برید توازن و صحت کے وکٹوریائی تصورات کو اپناتے ہوئے نہیں کی تھی۔ کلیمنز تو عوامی مذاق کے مطالبات کا پاس کرتے ہوئے روزمرّہ کو فن بنا دینے کے امکانات کا جائزہ لے رہا تھا۔!

۱۸۷۱ء میں اس کی کتاب "ROUGHING IT" کافی کامیاب ثابت ہوئی۔ بقول ایک تبصرہ نگار "یہ غریب، امیر، خوش باش اور بخور غرض ہر ایک کی ضرورت کے مطابق تھی" اور ساتھ ہی ہنسی ٹھٹھول کا بھی ایک تیر بہدف نسخہ تھی۔ علاوہ ازیں یہ سیر و سیاحت کی بھی ایک کتاب تھی اور اس قسم کی کتاب مارک ٹوین ہمیشہ بہت اچھی لکھا کرتا تھا۔ اس میں خشکی یا پانی پر، سفر کے دوران،

ایک کہانی کے بعد دوسری کہانی کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس میں غصّے کا ہر جزو موجود ہوتا تھا، لاف زنی، نہایت دھڑلّے کا کوئی منھ پھٹ آدمی، مہم میں ہیجان انگیز واقعات، رسم و روایت سے لوگوں کی خام زندگی پر گہری نظر، لوک کہانیاں اور جانوروں سے متعلق داستانیں۔ اس کا اثر بدیہہ گوئی کا سا ہوتا تھا، جیساکہ کلیمنز نے بعد ازاں خود کہا تھا کہ کہانی میں بیان اس طرح جاری رہنا چاہیے جس طرح کوئی ندی بہتی ہے، جو سنگ راہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی نظر آتی ہے۔ تاہم اپنے راستے پر، سرشار و سرمست، رواں دواں رہتی ہے۔

یہ حرکی تاثر اس کی کتاب عہدِ ملمّع سازی مطبوعہ ۱۸۷۳ء میں نہیں ملتا۔ یہ کتاب اس نے ہرٹ فورڈ میں اپنے ہمسائے چارلس ڈڈلے وارنر کے اشتراک سے لکھی تھی۔ کتاب کے ابتدائی ابواب میں کلیمنز، سرحدی زندگی کی یادداشتوں سے مواد اخذ کر کے ایسے مناظر تخلیق کرتا ہے جو "ٹوبیکو روڈ" یا LI'LABNER کے مناظر سے مماثلت رکھتے ہیں۔ مؤخر الذکر کتابوں میں پسماندہ علاقوں کے لوگ اس دولت کے بے پایاں خواب دیکھتے ہیں۔ جس کے حصول کے لیے نہ ان کے پاس قوت ہے اور نہ قابلیت —— کرنل بیریا سیلرز ایک پہاڑی قصبے کا میکابر ہے لیکن جس کی تصویر کشی ایسے لوگوں اور کرنل کے اُن رشتے داروں کی یادداشتوں سے کی گئی ہے جن سے سیموئل کلیمنز واقف تھا۔ دریا کے کچھ مناظر بڑی خوبصورتی سے پیش کئے گئے ہیں۔ جوں ہی منظر واشنگٹن اور نیویارک منتقل ہوتا ہے اس وقت ناول سیاسی بدکرداری، امریکی طریق انصاف اور سٹّے بازی کے جنون پر طنز آمیز مزاح کو چھونے لگتا ہے۔ اس طرح یہ

اپنے زمانے کا ایک مقبول ترین ناول بن جاتا ہے اور اپنے دور پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے وہ ایک خاص نام سے متصف کر دیتا ہے۔ لیکن فنی طور پر یہ ناول کامیاب نہیں تھا کیونکہ اس میں پلاٹ اور مخالف پلاٹ کے بوجھ تلے اصل کہانی کا شیرازہ بکھر جاتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اسے مارک ٹوین کی بہترین کتابوں میں شمار نہیں کیا جاتا۔

کلیمنز کو اگر کوئی کہانی بیان کرنے کے لیے دیدی جاتی تو اسے وہ ہمیشہ نہایت اچھے انداز میں پیش کرتا تھا۔ داستان گو کی حیثیت سے وہ اپنی کتاب "ممالک غیر میں معصوم افراد" میں ہی پختگی حاصل کر چکا تھا، تاہم قصوں کا اختراع اس کے لیے آسان کام نہ تھا۔ جب وہ چالیس برس کو پہنچا اس وقت تک وہ اپنے ذخیرے کی تمام کہانیاں لکھ چکا تھا۔ اس نے اپنی مختلف قسم کی تحریریں "نئے اور پرانے خاکے" کے عنوان سے ایک کتاب میں جمع کر دیں اور مارکیٹ کی طلب دیکھتے ہوئے مقبول عام کرنل سیلرز کی مزید مہماتی کہانیاں ایک نئی کتاب میں سمونے کی کوشش کی جو کئی سال بعد ۱۸۹۱ء میں "امریکی دعویدار" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ تاہم یہ کتاب خاطر خواہ مقبولیت حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ ہینی بال میں گذاری ہوئی، ابتدائی زندگی کی بنیاد پر اس نے ایک لڑکے کی کہانی لکھنے پر محنت کی لیکن یہ بھی کوئی خاص مقبول نہ ہوئی۔

بالآخر ایک دوست کی ترغیب پر، اس نے اپنے حافظے میں، دخانی کشتی کے ایام ترتیب دئے، اس میں مشکل ہی سے اس نے کوئی خاص انداز وضع کیا۔ مسی سپی پر "قدیم ایام" کے عنوان سے ۱۸۷۵ء میں اس نے سات قسطوں

میں ماہنامہ "اٹلانٹک" کے لیے یہ کہانی لکھی۔ آٹھ سال بعد اس کہانی کو کتابی شکل دینے کے لیے اس نے اکتالیس ابواب کا اضافہ کیا اور کتاب کا نام "مس سپی پر زندگی" رکھا تھا۔ اگرچہ اس نے اضافی مواد کو بڑی محنت سے ترتیب دیا تھا، لیکن پھر بھی اس میں ابتدائی حصّوں جیسی دلکشی خال خال ہی ملتی ہے۔ اس کہانی میں جو اندازِ نظر ہے، وہ اوّل تا آخر ایک ایسے لڑکے کا ہے جو مسی سپی کے سحر میں مبتلا ہے اور جو ملاّح بن کر دریا کے اسرار و رموز سے آگاہی حاصل کرتا ہے۔ یہ دانائے راز ہونے کی کہانی ہے۔ پائلٹ ہاؤس سے نظارہ کرتے ہوئے دریا کی بیشتر دلفریبی معدوم ہو جاتی ہے۔ اس کے خارجی حسن کے نیچے، جہاں سورج کی نقاّشی اور بادلوں کی پرچھائیاں ہیں، وہاں درختوں کی گانٹھوں اور پوشیدہ چٹانوں کا کٹھور خطرہ بھی ہے۔ یہ دریا بیوفائی سے اپنے ساحل بدلتا رہتا ہے۔" اس نے ایک بار کہا تھا۔ "رخ آب ایک ایسی حیرت انگیز کتاب ہے جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔" وہ تمام پیشے جو بعد ازاں اس نے اپنائے تھے ان میں سے کسی ایک کو بھی وہ اتنا پسند نہ کرتا تھا جلتنا کہ ملاّح کے پیشے کو۔ "ان دنوں روئے زمین پر صرف دخانی کشتی کا ملاّح ہی مکمل طور پر آزاد اور بے قید انسان ہوا کرتا تھا۔"

دریا پر ہی وہ "انسانی فطرت کی ان مختلف صورتوں سے جو ہمیں افسانے، سوانح یا تاریخ میں ملتی ہیں، بااحسن طریق ذاتی طور پر شناسا ہو گیا تھا۔" وہ دریا پر جس کسی سے بھی ملاقات یا واقفیت حاصل کر چکا ہوتا دوبارہ اس سے مل کر یا اس کے بارے میں پڑھ کر، پُرجوش ذاتی دلچسپی لیے بغیر نہ رہتا۔ لیکن یادوں کے

سہارے ترتیب دی ہوئی تمام تر تفصیلات کے باوجود کتاب "مسی سیپی پر قدیم ایام"، بندھے ٹکے مفہوم میں مبنی بر حقیقت نہیں ہے۔ اس میں قصہؔ گو ان لوگوں کی طرف شاذ ہی دیکھتا ہے جو پائلٹ ہاؤس میں داخل نہیں ہوتے —— جیسے مثال کے طور پر ٹھگ، جواری، بد قماش عورتیں یعنی وہ لوگ جو مسی سیپی کے سٹیمروں پر نفع بخش کاروبار میں مشغول رہتے ہیں۔ وہ اپنی تمام تر توجہ دریا کی جانب اور ذہن اس نظم و ضبط کی طرف منعطف رکھتا ہے جس کا تقاضہ دریا اپنی دلفریبی، نیز اپنے خطرے اور بھید جاننے والوں سے کرتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے تھے جو اپنے کام میں مہارت رکھتے تھے اور دریا کے خطرات میں گھر کر نہ صرف اپنا راستہ ڈھونڈ نکالتے تھے بلکہ سلامتی کے ساتھ دوسروں کی رہنمائی بھی کیا کرتے تھے۔ اس طرح یادِ ایام کا بیان اُس زمانے کی "تخلیق مکرّر" بن جاتا ہے جو رفت و بود ہو چکا ہے۔ اور وہ زمانہ اب اس لیے واپس نہیں آئے گا، کیونکہ وھیل مچھلی کے شکار کی طرح (جس کا میلول نے "موبی ڈک" میں ذکر کیا ہے) دخانی کشتی کا چلن بھی اس طریقِ زندگی کا ہی نتیجہ تھا جو قصہ ماضی بن چکا ہے۔ یہ کہانی حقیقت کے برعکس خواب و خیال، معصومیت، تجربے اور خطرات کی دنیا میں انسانی ذمہ داری نیز فریضہ ادب کے ایک تصوّر کا ذکر کرتی ہے۔

ٹام سائر کی مہمات نے ۱۸۷۶ء میں مارک ٹوین کو ایک بار پھر کثیر الاشاعت مصنفوں کا سرخیل بنا دیا۔ اس میں دریائے مسی سیپی دوبارہ بڑی ہی آن بان سے ظاہر ہوا۔ ریاست ہائے متحدہ میں شاید ہی کسی کتاب نے اتنی مقبولیت حاصل کی ہو۔ پہلی نظر میں یہ کتاب ایسی بے ربط اور بے وضع محسوس ہوتی ہے

جیسا کہ خود مارک ٹوین بے ربط اور بے ڈھنگ تھا۔ واقعات کی تشکیل اس انداز سے کی گئی ہے کہ نوجوانوں کو یہ خوشگوار یاد دہانی کرائی جا سکے کہ وہ پہلے کیا تھے۔ قتل اور تعاقب کے پلاٹ جو نوجوان قارئین کی دلچسپی کی خاطر بالالتزام گھڑے گئے ہیں، ان کی نسبت لڑکپن کے یہ ذیلی واقعات حافظے میں زیادہ دیر تک محفوظ رہتے ہیں۔ لیکن اس میں فن کاری بھی ہے —— ایک ایسے داستان گو کے فن سے کہیں آگے کی فنکاری جو ہمیشہ علاقائی معاشرے سے متعلق معمولی حقیقت نگاری کو بروئے کار لاتا ہے۔ شاید چونکہ اس نے اس پہلے خود تجرباتی ناول پر طویل عرصے کام کیا تھا اور اس کی اشاعت اس وقت عمل میں آئی تھی۔ جب مصنف چالیس کے پیٹے میں تھا، اس لیے یہ بعد کے ناولوں سے زیادہ بہتر ترتیب و تشکیل کا حامل ہے۔ اس ناول کا ڈھانچہ معنی کی کئی ایسی تہیں ظاہر کرتا ہے، جنہیں مارک ٹوین خود بھی نہ جانتا تھا۔ اس کی کہانی تقریباً تین مساوی حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں دس ابواب ہیں۔ دس ہی دوسرے حصے میں ہیں اور کلائمکس والے تیسرے حصے میں تیرہ ہیں۔ پہلا حصہ دوسرے سے اور دوسرا تیسرے سے، ایک میانی باب کے ذریعے الگ ہو جاتا ہے۔ تینوں حصوں کے اندر واقعات کی تفصیل بڑی احتیاط سے دی گئی ہے۔ وقت واقعہ بہ واقعہ، دن بدن، آہستہ آہستہ گذرتا ہے۔ درمیانی ابواب میں وقت کی رفتار نہایت تیز ہو جاتی ہے اور کئی ہفتے چند صفحات پلٹتے ہی گذر جاتے ہیں۔ ہر حصہ دوسرے حصوں سے لب و لہجہ میں مختلف ہے۔ ان مہمات کی نوعیت میں جن میں ٹام خود کو الجھاتا ہے، نیز اس باہمی رشتے میں جو ان مہمات کا

پوری کہانی کے موضوعی شیرازے سے ہے ، ہر حصہ دیگر حصوں سے مختلف نظر آتا ہے۔

پہلے دس ابواب میں لڑکے خاص کھیل میں مشغول دکھائے گئے ہیں۔ جام چراتے ہوئے ، دہوکی ، کھیلتے ہوئے ، جمع شدہ سامان کی ادلا بدلی کرتے ہوئے ، ــــــ انجام کار ، نیم شب ، میں وہ قبرستان جاتے ہیں اور وہاں بلا قصد ایک قتل کا نظارہ کرتے ہیں۔ جمعہ کی سہ پہر سے سوموار کی رات تک ، وقت کا ٹھیک تعیّن کیا گیا ہے ، لیکن پھر اوّلین درمیانی باب میں مف پاٹر ارتکاب جرم میں گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ لڑکے جانتے ہیں کہ اُس نے یہ جرم نہیں کیا۔ اس طرح دو ہفتے گذر جاتے ہیں۔ دوسرا حصہ ، بارھویں باب سے اکیسویں تک ، دو اہم واقعات میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی "جیکسن جزیرے کی مہم" اور "اسکول میں آخری دن"۔ وقت کی رفتار پھر مدھم ہو جاتی ہے ، لڑکے دوبارہ کھیل کود میں لگ جاتے ہیں ، لیکن لڑکوں کا یہ محض بچکانہ سادہ کھیل نہیں ہے ، اب یہ کھیل معمّر لوگوں کے خلاف ہے۔ ٹام کی طرح سادہ لوح معصومیّت سے آگہی اور بالواسطہ طور پر بدی میں شمولیّت کی جانب بڑھنے والے لڑکوں کے بارے میں جو رویّہ اور نظریہ دنیا میں پایا جاتا ہے ، گویا یہ لڑکے اس رویّے کے خلاف بغاوت کر رہے ہیں۔ دوسرے درمیانی باب میں ، مف کی معصومیت سے ، لڑکوں کی مجرمانہ واقفیت کی بنا پر ، ایّام گرما جلد گزر جاتے ہیں۔ اِس کے بعد کہانی کا پلاٹ ، ہنگامہ خیز نقطۂ عروج کی طرف حرکت کرنے لگتا ہے۔!

آخری تیرہ ابواب میں، لڑکے بالغوں کی طرح آزمائشی نوعیت کے کام شروع کر دیتے ہیں۔ ٹام عدالت میں گواہی دیتا ہے۔ وہ اور ہَک سنجیدگی اور سوجھ بوجھ کے ساتھ انجنو کا چپ چاپ تعاقب کرتے ہیں اور اس خزانے کی تلاش کرتے ہیں جو محض طفلانہ کھیل کا واہمہ نہیں، بلکہ حقیقی ہے۔ پھر ٹام ذمہ داری کا بوجھ اتار پھینکتا ہے اور پکنک منانے چلا جاتا ہے۔ وہ اپنے پیچھے حقیقت پسند ہَک کو قاتل کی تلاش کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔ ہَک اس کا پتہ تو لگا لیتا ہے، لیکن قاتل ڈر کر پھر ایسی کمین گاہ میں چھپ جاتا ہے جہاں سے نکل کر دوبارہ حملہ کرنا اس کے لیے مشکل نہیں ہے۔ "ٹام سائر کی مہمات" میں بالغوں کا یا بالغوں کی طرح کا کوئی اقدام کامیاب نہیں ہوتا۔ پہلے حصے میں پچی پولی، ٹام کے ذریعے باڑھ پر سفیدی کرانے کی کوششوں میں ناکام ہوتی ہے۔ دوسرے حصے میں، بڑی عمر کے لوگ ان لڑکوں کی تجہیز و تکفین کا انتظام کرتے ہیں جو مرے نہیں ہیں، اور اسکول ماسٹر اپنے بالوں کی لٹ سے محروم ہو جاتا ہے۔ اب جوں جوں کہانی اختتام کے نزدیک پہنچتی ہے بالغوں کی منصوبہ بندی غلط راہ اختیار کر لیتی ہے۔ اس سے پیشتر کہ ان کی تلاش شروع ہو۔ ٹام اور بیکی گھنٹوں غار میں گم رہتے ہیں۔ لیکن بالغوں کی کھوج اس طرح بار آور نہیں ہوتی جس طرح کہ فساد کی جڑ انجنو کا قلع قمع کرنے کی کوشش۔ ٹام کی تخیلی دریافت اس سلسلے کے آخر میں انہیں حفاظت و عافیت تک لے آتی ہے —— یہاں تک کہ جب بڑی عمر کے لوگ غار کا منہ بند کر دیتے ہیں تو یہاں بھی ان کا مقصد قاتل کو پکڑنا نہیں

بلکہ محض ٹام جیسی مہم کے اعادے کا تدارک ہوتا ہے۔ سادہ لوح معصومیت جو تخیلی اور غیر مغلوب ہوتی ہے، نیز دنیوی مسائل سے دست و گریبان ہونے کے پختہ کار طریقوں سے ارفع، اس کا اظہارِ حسن ہی ایک ایسا موضوع تھا جو اکثر اوقات مارک ٹوین کے نوک قلم پہ رہتا تھا۔

کئی سال تک کلیمنز متفرق موضوعات پر لکھتا رہا۔ ان تحریروں میں اس کی فراموش شدہ مقبول عام کتاب "پنچ برادرز پنچ اور دوسرے خاکے" مطبوعہ ۱۸۷۸ء، نیز ۱۸۸۰ء کا اس کا دوسرا سیاحت نامۂ یورپ "جہاں گشت ممالک غیر میں" شامل نہیں۔ ۱۸۸۲ء میں ایک بار پھر کلیمنز اس موضوع کی جانب "شہزادہ اور قلّاش" میں لوٹا، لیکن اُسے کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ایڈورڈ ششم کے دربار میں ٹام کینٹی (TOM CANTY) کے مہماتی واقعات لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے ہی لکھے گئے تھے۔ اِس کا مسودہ کلیمنز اور اس کے دوستوں کے بچّوں کو ان کی رائے معلوم کرنے کے لیے پڑھ کر بھی سنایا گیا تھا۔ تاہم، پہلو بہ پہلو اس میں بڑی عمر کے لوگ بھی اس کے مخاطب تھے۔ مقصد اس کا مصنف کی اس مستقل یاد دہانی کا اظہار تھا جس کی رو سے تمام تر کمزوریوں کے باوجود ریاست ہائے متحدہ میں مروّجہ جمہوریت ہر جگہ کے طریق زندگی سے کہیں بہتر ہے۔ یہ ایک قسم کی ہیجانی کہانی ہے، جسے ٹام سائر یوں بیان کرتا کہ ایک غریب لڑکا تو بادشاہ کا وارث بن گیا اور ایک شہزادے نے عام لوگوں سے میل ملاپ کرکے انکساری کا سبق سیکھ لیا۔

کلیمنز نے اپنے ایک دوست سے کہا تھا "میرا مقصد اس دور کے کڑے قوانین کو خود بادشاہ پر عائد کر کے ان کا حقیقت پسندانہ احساس پیدا کرانا ہے!" غربت جو انسان کو حیوان بنا دیتی ہے اور امتناعی قوانین جو انسان کو چوری چکاری پر مجبور کر دیتے ہیں، وہ ان سب کا مضحکہ اڑاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ توہمات اور بے معنی رسوم کو بھی آڑے ہاتھوں لیتا ہے۔ مارک ٹوین نے اپنی خفیہ طور پر طبع شدہ قدرے فحش کتاب "۱۶۰۱ء یا عہد ٹیوڈر میں آتش دان کے گرد گفتگو کی جھلکیاں" میں قدیم انگلستان کی جس زبان کا دو سال پیشتر تجربہ کیا تھا اب وہ مزاح و تضحیک کا بھرپور روپ اختیار کر لیتی ہے۔ جب ٹام کی ناک میں اذیت ناک خارش ہوتی ہے تو وہ پوچھتا ہے "اس صورت حال سے نبٹنے کے لیے کیا ریت یا رسم ہے؟" وہ اپنی جیبیں اخروٹوں سے بھر لیتا ہے اور انہیں توڑنے کے لیے شاہی مہر استعمال کرتا ہے۔ جب ہنری ہشتم کا انتقال ہو جاتا ہے اور اس کی تجہیز و تکفین کسی شبھ گھڑی کے انتظار میں موقوف کر دی جاتی ہے، اس پر یہ لڑکا یوں تبصرہ کرتا ہے کہ "یہ ایک نہایت عجیب حماقت ہے۔ کیا یہ جنازہ اسی طرح پڑا رہے گا؟" مشکل ہی سے کوئی ایسی مزاحیہ بات ہو گی جس کی عوام الناس مارک ٹوین سے توقع رکھتے تھے یا انسانی کمزوریوں کی شاید ہی کوئی ایسی دانشمندانہ بصیرت ہو گی، جس کا ذکر "شہزادہ اور قلاش" میں نہ کیا گیا ہو۔

اس حقیقت کے باوجود "شہزادہ اور قلاش" مارک ٹوین کی سابقہ کتابوں

کی طرح تجارتی طور پر منفعت بخش ثابت نہ ہوئی - کلیمنز اس کی بڑی وجہ ناشر کی تبدیلی تصوّر کرتا تھا - یہ ناشر پیشگی رقم منگا کر کتابوں کی بڑی تعداد فروخت کرنے میں ناتجربہ کار تھا - چنانچہ اب کلیمنز نے خود اپنا اشاعت گھر قائم کیا اور ۱۸۸۵ء میں ایک اور لڑکے کے بارے میں کتاب چھاپ کر آغاز کار کیا - اس نے بڑی احتیاط سے اس کتاب کا رشتہ عوام الناس کے ذہن میں اس حوصلہ افزا مقبول عام کتاب سے جوڑ دیا جس میں مسی سیپی کے کنارے ایک نوجوان لڑکے کی کہانی بیان کی گئی تھی - نئی کہانی کے ہیرو کو پرانی کہانی سے ایک ذیلی عنوان "ٹام سائر کا رفیق کار" کے تحت مربوط کر دیا - "ہکل بیری فن کی مہمات" نے قارئین کو سابقہ کتاب کی طرح اتنی جلد متاثر نہیں کیا - میساچوسٹس میں کنکارڈ کے مقام پر جسے اب بھی نیو انگلینڈ کے شرفا کی ثقافتی آرزوں کا گہوارہ سمجھا جاتا ہے، اس کتاب کو نوجوانوں کے لیے مضرّت رساں قرار دے کر مقامی لائبریری سے خارج کر دیا گیا - کچھ برسوں کے بعد، ڈینور، اوہاما، اور حتّٰی کہ بروک لین میں بھی اس پر پابندی لگا دی گئی - جب اس کے ابواب "سنچری میگزین" میں شائع ہوئے تو کچھ قارئین نے اُسے ناقابل تردید گھٹیا پن سے مملو پایا اور انہوں نے اس میں "نام کو بھی کوئی خوبی یا بہتر بات نہیں دیکھی"۔

لیکن "ہکل بیری فن کی مہمات" نے اپنے مخالفوں کی حرف گیری اور تنقید کو پس پشت ڈال کر ایک ایسی قومی کلاسیک کی حیثیت اختیار کر لی ہے جسے ہر اس شخص کے سامنے فخر کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے جو اب بھی یہ پوچھنے کی جرأت کرتا ہے کہ "ایک امریکی کتاب کون پڑھتا ہے"؟ اس کتاب کی

صحت ان لاتعداد گلا گھونٹ شارحین کی وجہ سے خطرے میں ہے جو اپنی غیر معمولی توجہ سے اُسے لنج پنج بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ سوائے "موبی ڈک" کے زمانۂ حال میں تشریح کی خاطر شاید ہی کوئی اور دوسری کتاب اتنی ہمدردی سے پڑھی گئی ہو۔ یا جن نقادوں کی رائے ہم سننا پسند کرتے ہیں انہوں نے شاید ہی کسی اور کتاب کی طرف اتنی توجہ دی ہو جتنی کہ اس پر دی ہے۔ دریا جس پر یا جس کے کنارے کہانی عمل میں آتی ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے نزدیک، ایک عظیم بھورے رنگ کا دیوتا ہے۔! اور لائنل ٹرلنگ ایمرسن کی تحریروں کے عصری مفاہیم بتلاتے ہوئے، "عظیم دریا کے لطیف اور واضح اخلاقی معنی" سمجھاتا ہے۔ وہ تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "دولت کے دیوتا کے بالمقابل دریا کا دیوتا کھڑا ہے، ایک ایسا دیوتا جس کے تبصرے خاموش ہیں" اور یہ کہ ہک "دریا کے دیوتا کا خدمت گار۔!" مسٹر ایلیٹ نے یہ صحیح کہا ہے کہ "دریا تو خود ہمارے اندر موجود ہے"!

دوسرے شارحین ایک مہم جُو لڑکے کی اس کہانی میں ہماری توجہ معاشرتی تنقید، ہجو اور حیوانیت کی طرف مبذول کراتے ہیں۔ وہ اس کتاب کی، صاف اور سلیس، سادہ اور فطری زبان کی جانب ہم کو متوجہ کرتے ہیں۔ ان خصائص کی بنا پر ہی ہیمنگوے اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ یہ شارحین اس کہانی کے ڈھانچے کی طرف بھی توجہ دیتے ہیں۔ اس کا ڈھانچہ جو ایک وقت میں یا کسی ایک نقاد کی نظر میں تو عظیم فن کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن دوسرے وقت ایک دوسرے نقاد کے لیے ہی ایک اوٹ پٹانگ بدیہہ گوئی بن جاتا ہے۔ شرح

کرتے ہوئے اِس امیجری کی نشان دہی کی جاتی ہے، جو اس میں بہ تکرار آتی ہے یعنی ایسی جیسی کہ ای، ایم فارسٹر نے "مارسل پروست" کی تحریروں میں بتلائی ہے اور جسے تکرار بذریعہ تنوّع کہتے ہیں۔ اس کی افسانوی خوبی مقبول عام لوک کہانیوں اور توہماتی عناصر کی مدد سے بیان کی جاتی ہے یا پھر دور وحشت کے سنگاروں کی مماثل رسوم سے ان کی شرح کی جاتی ہے۔ جس طرح کبھی کبھی تین حصّوں میں منقسم معروف سیاہ فام گویّے کا تماشہ ہوا کرتا تھا اور جو ایک خالص دیسی آرٹ فارم تھا، اسے "ہکل بیری فن کی مہمات" میں رشد وہدایت کی مماثلت پیدا کرنے کے لیے منطبق کیا گیا ہے۔ اس موضوع کی مختلف تشریحات ہیں جن میں سے کچھ ناگزیر طور پر مذہبی رنگ کی بھی ہیں۔ تاہم یہ سب نہایت دقت نظری سے احاطۂ فکر میں لائی گئی ہیں۔ اس کہانی کی غیر مختتم حالت ایسی ہے گویا مہمّات کا سلسلہ ہمیشہ ہی جاری رہے گا۔ امریکیوں سے مخصوص، دیگر فنی تدبیروں کی طرح، جن میں پیداوار سے زیادہ طریقۂ کار پر زور دیا جاتا ہے، اور جس کا ثبوت "سکائی سکریپر" "جاز" "کامک سٹرپ"، "چیونگ گم" اور "موبی ڈک" میں ملتا ہے، بعینہ یہ غیر مختتم خوبی یہاں بھی اوّل تا آخر برقرار رکھی گئی ہے۔

چونکہ ان تمام باتوں کو ژرف بیں قارئین نے دریافت کیا ہے اس لیے غالباً یہ سب کی سب درست ہیں۔ ان باتوں کی جامع اور ترکیبی صحت یسموئل کلیمنز کی اضطراری زندگی میں ظاہر ہوتی ہے۔ وہ ایک پیشہ چھوڑ دوسرا پیشہ اختیار کر لیتا تھا۔ پیدائش کے اتفاق اور اپنی ان خصوصیات کی بنا پر وہ حالات پر قابو

پالیا کرتا تھا۔ اس کی ہمسری صحیح مقام اور موقعہ پر پیرانِ اخلاقیات بھی ہمیشہ نہیں کر سکتے۔ اس کی ذہنی صلاحیت یقیناً" ایک پیشرو کی تھی جو بعض اوقات خود سے بھی نامانوس ہو کر نہایت تند و تیز روپ دھارن کر لیتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ خود بھی اپنی مضحکہ خیزی پر قہقہے لگانے پر ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ اس کی تحریروں کا حُزن حتیٰ کہ اس وقت بھی جب مزاح و تضحیک کا موڈ اس پر غلبہ پالیتا تھا، ان غریب الوطن انسانوں کا سا ہوتا تھا جو لق و دق صحراؤں یا دریاؤں پر، جنگلوں یا پہاڑی کیمپوں میں غمناک گیت گاتے ہیں۔ اس کی جذباتی کیفیت اِن انسانوں جیسی ہی ہوتی تھی۔ اس صورت حال کے بھانپ لیے جانے پر وہ خود بھی قہقہے لگانے کے لیے تیار رہتا تھا۔ اس کا جارحانہ کھلنڈرا پن جو مغالطہ آفرینی اور عملی مذاق میں حظ لیتا تھا، اس کلاسیکی غصّے کے انداز میں بدل گیا جو دیوتاؤں میں پایا جاتا ہے، یا پھر اِن سادہ لوح انسانوں میں ملتا ہے۔ جن کا مذاق الٹا ان کو ہی اپنا ہدف بنا لیتا ہے۔

کلیمنز۔ امریکہ کے اندرونی حصوں، نیز سونے چاندی سے پُر، اُس مغربی خطّے سے خوب واقف ہو چکا تھا جہاں بے شمار لوگ دور دراز میدانی علاقوں سے اٹھ کر آباد ہو گئے تھے۔ اس نے جو کچھ بھی جانا اور سیکھا تھا ان سب سے کہیں بہتر اُس کا علم اس عظیم دریا کے بارے میں تھا جو اس خطے میں شریان کی حیثیت رکھتا تھا اور جس میں کبھی وسطی امریکہ کا حیات بخش خون گردش کیا کرتا تھا۔ ان مقامات پر جو بھانت بھانت کے لوگ تھے۔ وہ ان سب سے باخبر تھا۔ وہ یہاں کی دولت نیز ان معزز اور مرفع الحال لوگوں کی صحبت سے

بھی واقف تھا جنہیں وہ پہلے ہی ایک مخصوص طبقے کی حیثیت سے پہچانتا تھا۔ اس نے لوگوں کو غصّے اور مشیخت کے عالم میں مصروف گفتگو دیکھا تھا۔ ان کی کہانیاں اور چونچال باتیں سنی تھیں، ان کی طرح بات کرنا سیکھا تھا —— یہی وجہ ہے کہ اس کی آخری دریافت لسانی تھی یعنی ایک ایسی زبان کی تخلیق جو سادہ، ملائم اور رواں تھی، اور جس میں بقول رچرڈ چیز (RICHARD CHASE) "روایتی ادبی انگریزی کو نہایت خوش اسلوبی سے سلیس کر دیا گیا تھا"! اس سے پہلے کبھی کسی نے اس طرح عبارت آرائی نہ کی تھی۔ زیادہ مشکل تو یہ بات یاد رکھنی ہے کہ اس مؤثر طریق سے شاید ہی اب کوئی دوبارہ لکھ پائے گا۔ اس کی وجہ آسان الفاظ میں یوں بیان کی جا سکتی ہے کہ اس کے نمونے ادب سے مستعار نہیں لیے گئے تھے، بلکہ زندگی سے حاصل کئے گئے تھے۔ اگر وہ خود بھی اپنی کسی سابقہ تحریر کا چربہ اتارنے کی کوشش کرتا تو وہ ایسی کتابیں منظرِ عام پر لانے میں کامیاب ہوتا جو محض مارک ٹوین کے انداز میں تصنیف کی جانے کی بنا پر دلچسپ ہوتی تھیں۔

"ہکل بیری فن کی مہمات"، ایک ایسے لڑکے کی کہانی ہے جو ان آزادیوں کو قبول نہیں کرتا جو دنیا اسے بخش سکتی ہے۔ اسی لیے وہ ان آزادیوں سے ایک ایک کر کے اپنا پیچھا چھڑاتا ہے۔ قارئین کی ایک خاصی تعداد کی نظر میں، وہ ایسا اس لیے کرتا ہے کہ وہ انسان کی اضطراری اور ناگزیر روپوشی کی علامت بن سکے۔ علمی طور پر یہ بات دھیان کے قابل ہے کہ ٹوین کی یہ کتاب اس برس ہی چھپ کر منصّۂ شہود پر آئی تھی جبکہ اس کے دوست ولیم ڈین ہاولز

(WILLIAM DEAN HOWELLS) نے سائلس لیپھم کا عروج"
(THE RISE OF SILAS LAPHAM) میں ایک دوسری سادہ لوح ممتاز شخصیت پیش کی تھی - یہ سربرآوردہ فرد جس وقت جنجال اور پریشانیوں میں پھنستا ہے تو الٹے قدموں بھاگنے لگتا ہے - اس سے ایک سال پیشتر ہنری جیمز نے کلیمنز سے بالکل مختلف راستہ اپنا کر پختہ کاربن پر قلم اٹھایا تھا - اس نے "شہزادی کیساماسیما" (THE PRINCESS CASAMASSIMA) اور "اہالیان بوسٹن" دونوں ہی میں راست باز نوجوان دیہاتیوں کی اس جدوجہد کا اظہار کیا تھا جس کے نتیجے میں وہ سوسائٹی کے پیش کردہ مواعید ٹھکرا دینے پر مجبور تھے - ہر کسی نے اس معروف امریکی موضوع پر مختلف انداز سے لکھا - اس پر ایمرسن نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا - دھٹمین اور میلول نے بھی طبع آزمائی کی اور یہ اکثر اوقات اب بھی موضوع سخن بنتا رہتا ہے - یہ موضوع جمہوریت کا ایک ایسا عقدہ پیش کرتا ہے جس سے گریز ممکن نہیں - یعنی یہ کہ ایک شخص یکہ وتنہا بااختیار فرد کی زندگی کس حد تک گذار سکتا ہے ، اور معاشرے کو وہ اپنی شخصیت مسخ کرنے کی کہاں تک اجازت دے سکتا ہے ؟ اگر کلیمنز نے اس مسئلے کو اوروں سے بہتر طریق پر پیش کیا ہے یعنی متھ کی ایسی خوبیوں سے مزین کر کے جن میں "فنطاسیا" حقیقت نگاری ، طنز اور توہم کی آمیزش بھی شامل ہے تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اس کے معتقدات مختلف تھے بلکہ یہ کہ اس نے ایک ایسی لچکدار زبان پر دسترس حاصل کر لی تھی جس کی وساطت سے وہ ایک پُرکشش لڑکے کے

سچّے مشاہدات ، نیز جن مختلف قماش کے لوگوں سے اس کا واسطہ پڑا تھا ، ان کی مبہم تمناؤں کا ، اور ساتھ ہی لطافت سے مملو اس نحس لیکن زبردست روح کا بخوبی اظہار کرسکتا تھا جو اس کتاب میں ایک دریا کے روپ میں موجود ہے -!

ہکل بیری کے پیش کردہ مسئلہ آزادی کا حل بلا واسطہ اور غیر دنیوی ہے - معاشرہ کو آزما لینے کے بعد وہ کوئی حل قبول نہیں کرتا - وجہ یہ ہے کہ تہذیب بالآخر تمام انسانوں کو مجرم بنا دیتی ہے - ہک ایک سیدھا سادا لڑکا ہے ، اس کی واجبی سی تعلیم ہے اور وہ شگونوں میں گہرا اعتقاد رکھتا ہے - اس کے کردار کے جانچنے کا ایک پیمانہ فریب کی جانب اس کا جھکاؤ ہے - اگرچہ وہ اپنے مقصد میں ہمیشہ کامیاب نہیں ہوتا تاہم یہ اس کا جبلّی رجحان ہے - گویا یہ اس کی شخصیت کا ایک ایسا ہی حصہ ہے جیسی کہ اور دوسری وحشیانہ باتیں جو فطرت سے اس کا رشتہ استوار کرتی ہیں - یہ باتیں ٹام سائر کی روایت میں رچی بسی ہیں اور کتابوں سے سیکھی تخیلی فریب کاریوں سے قطعاً مختلف ہیں - ہک اور اس کا حبشی دوست دونوں ہی فطری انسان غلام بن گئے ہیں - ان کی آہستہ روُمہمات فاکنر کے "ریچھ" میں موجود کردار آئک میک کیسلن (IKE MCCASLIN) اور اس کے نیم حبشی اور نیم انڈین گائیڈ کی خاصی باشعور تجسّس کاریوں سے مماثلت رکھتی ہیں ، اور ایسا صرف اس وجہ سے ہے کہ ان کی جس آسانی سے تشریح کی جاسکتی ہے اُس سے کہیں زیادہ یہ مفہوم کی تہیں سمجھاتی ہیں -!

نوجوان ہک نے چونکہ انجنو کا کھوج لگانے میں ٹام سائر کی مدد کی تھی اس

لیے ساحل دریا پر واقع اس چھوٹے سے گاؤں میں اس نے ہیرو کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ اُسے ڈگلس کی بیوہ نے متبنیٰ بنا لیا تھا۔ وہاں اُسے نہلایا دھلایا جاتا، صاف کپڑے پہنائے جاتے اور مدرسے بھیجا جاتا۔ ٹام کے ساتھ وہ روزانہ ایک ڈالر کی ناقابل یقین دولت میں حصہ بٹاتا۔ یہ رقم یافت کی صورت میں دونوں اس خزانے سے حاصل کیا کرتے تھے جسے "ٹام سائر کی مہمات" میں انہوں نے دریافت کیا تھا۔ تاہم ہک خوش نہ تھا۔ ٹام کی بہانہ سازی اس کے لیے ناقابلِ فہم ہے۔ جزا کا حامل وہ مذہب جس کی تعلیم بیوہ کی بہن مس واٹسن دیتی ہے کچھ بھی تو مفہوم نہیں رکھتا۔ مذہب عشق جو کہ بیوہ سمجھاتی ہے ایک بہتر مذہب ہے، تاہم وہ خود اُس جھمیلے میں نہیں پڑتا۔ جب اس کا بے رحم باپ واپس آتا ہے اور ہک کو دریا کے پار لکڑی کے ایک ویران مکان میں لے جاتا ہے تو یہ لڑکا اطمینان قلب کے ساتھ اس خلاف منشاء منتقلی کو قبول کر لیتا ہے۔ اگرچہ وہ اپنے باپ کی مارپیٹ اور حالت نشہ کی قہرمانیوں سے خوف زدہ ہے تاہم وہ پابندی اوقات، چست کپڑوں اور سکول کی قیود سے آزاد ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی اس موعظمت اور خیالات کے ان پریشان کن الجھیڑوں سے بھی اس کو نجات مل جاتی ہے جو دیہاتی زندگی کو پراگندہ کر دیتے ہیں۔ لیکن اپنے باپ کے ساتھ زندگی کا اس طرح جکڑا جانا اسے نہایت مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ رات کے وقت، دریا کے راستے، جزیرۂ جیکسن کھسک جاتا ہے۔ یہاں اس کی ملاقات مس وٹسن کے حبشی غلام، جم سے ہوتی ہے۔ چونکہ اس کا عیسائی آقا اسے فروخت کرنے والا تھا اس لیے یہ اپنے گھر سے بھاگ

نکلا تھا۔

اس طرح "ہکل بیری فن کی مہمات" کے پہلے گیارہ ابواب میں خشکی کی ان مہمات کا ذکر ملتا ہے جن میں ہک حیران و پریشان، بحالت فرار یا زار و نزار دکھائی پڑتا ہے۔ اگلے بیس ابواب مراجعت یا بازپسی کے انداز میں دریا پر یا دریا کے کنارے ان مہمات کی تفصیل بتلاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہک اور جم اپنے "چوگھڑے" کے ساتھ اس جانب تیرتے ہیں جہاں ان کی توقع کے مطابق دونوں کو آزادی نصیب ہوگی۔ دریا اور اس کے ساحلوں پر ان کا مختلف النوع لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ ان میں سے بیشتر احمق، بدقماش اور کمینے ہوتے ہیں، یعنی خونی، قاتل، جعلساز، نوسرباز، جھوٹے۔ دغاباز، بزدل اور بردہ فروش ——— یہ ہر قسم کی ریاکاری میں طاق ہیں، معاشرے سے علیحدگی جو زندگی چوگھڑے پر عطا کر سکتی ہے، یہاں اس میں بھی خلل پڑ جاتا ہے، کیونکہ کمینہ پروری اس جگہ بھی عجیب و غریب روپ اختیار کر کے، دخل انداز ہوتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ عظیم بھورے دریا کی روانی بھی یہاں قابل اعتماد نہیں کہی جا سکتی۔ یہ دریا جم کو آزادی سے دور بہالے جاتا ہے، یعنی اس مقام پر جہاں ایسے معزز اور مہربان لوگ اسے دوبارہ پکڑ لیتے ہیں جن کے ضمیر انسانی غلامی پر مضطرب نہیں ہوتے۔

آخری بارہ ابواب کے واقعات دوبارہ خشکی ہی پر عمل میں آتے ہیں۔ ٹام سائر ایک بار پھر نمودار ہوتا ہے۔ وہ جم کی گلو خلاصی کے لیے رومانی خیالات سے لبریز ہے۔ ہک بھی اس احمقانہ تگ و تاز میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہ ٹام کا

احترام کرتا ہے، اگرچہ اُسے سمجھنا اس کے بس کی بات نہیں۔ دریا پہ ہوتے ہوئے جب کوئی افتاد پڑتی تو وہ اکثر ٹام کو یاد کیا کرتا یا پھر کمال ہوشیاری سے جب وہ دقتوں پر غالب آتا تو اس وقت وہ خواہش کیا کرتا، کاش ٹام یہاں ہوتا اور وہ میری مدد اور ستائش کرتا! لیکن ان لڑکوں نے رہا کرانے کا جو ایک بہانہ بنایا تھا وہ اب تمسخر انگیز فعل بن جاتا ہے، کیونکہ مس واٹسن نے جم کو پہلے ہی آزاد کر دیا تھا اور اب وہ غلام نہیں رہا تھا۔ کہانی بڑی سرعت سے انجام پذیر ہوتی ہے، گویا مزید طوالت پریشان کن بن جاتی۔ اسی لیے ڈھیلے ڈھالے اختتامی حصے باہم مربوط کر دیئے گئے ہیں۔ ہک کا باپ مر چکا ہے۔ جم ہم سفری کی پہلی منزل سے ہی یہ بات جانتا تھا لیکن اس نے ازراہِ مہربانی یہ ظاہر نہ ہونے دیا۔ ہک کی راہ آزادی میں جو ایک خطرہ تھا وہ ختم ہو جاتا ہے، تاہم ایک خطرہ باقی رہتا ہے۔ وہ یہ کہ نیک دل لوگ اس بہادر تیج لڑکے پر ایک بار پھر رحم کھاتے ہیں، اور اسے متبنیٰ بنا لینے کی پیش کش کرتے ہیں، لیکن ہک اسے قبول نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے۔ "میں پہلے بھی متبنیٰ بن کر وہاں رہا ہوں لیکن اسے اب میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

ان آخری ابواب کے بارے میں بطور تنقید و تائید، بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ بعض قارئین کے نزدیک یہ اس حقیقت کی تصدیق کرتے ہیں کہ کلیمنز کو پلاٹ پر دسترس حاصل نہیں تھی۔ کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ اختراعات جنہیں نہایت باریک بینی سے معرضِ عمل میں لایا گیا ہے اور جو ٹام سائر کے لیے بے حد پسندیدہ تھیں۔ ان کی جانب کلیمنز کی رغبت ایک مجبوریِ محض تھی۔

تاہم کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ان کو عین مناسب اور درست سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کہانی اور موضوع کی تکمیل کے لیے ان کی حیثیت ناگزیر ہے۔ اسی طرح ہَک کے کرداری ارتقاء پر طرح طرح کے خیالات پیش کئے گئے ہیں۔ دُنیا اور اس کے طرزِ عمل پر اس کی دل برداشتگی، خاص طور پر حبشی جم کی جانب اس کی تبدیلیٔ رویّہ کو زیرِ بحث لایا گیا ہے، جس کے مطابق وہ جم کو بالآخر کار اپنے جیسا ہی انسان تسلیم کر لیتا ہے۔ وہ اسے ان تمام سفید فام لوگوں سے زیادہ شائستہ اور راست باز سمجھنے لگتا ہے جو اسے یا اس کی نسل کے دوسرے لوگوں کو غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں۔ چند لوگوں کے نزدیک یہ مفروضہ ہی خاص کشش کا باعث ہے کہ بنیادی طور پر اس کی شخصیت مطلقاً ارتقاء پذیر نظر نہیں آتی، چونکہ وہ فطرت کا بچّہ ہے اس لیے اس کی شخصیت تغیّر آشنا نہیں ہو سکتی۔ بہر کیف ایک بات تو سب ہی تسلیم کرتے ہیں کہ جن اوصاف نے اس کتاب کو امریکی ادب میں بلند مرتبہ بخشا ہے وہ ہَک کی شخصیت اور دنیا کے بارے میں اس کا مخصوص اندازِ نظر ہی ہے۔

"ہکل بیری فن کی مہمات" کے بارے میں قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ اس کہانی کا راوی مارک ٹوین نہیں ہے۔ ہَک پہلے ہی پیراگراف میں اس کی وضاحت کر دیتا ہے کہ "مسٹر مارک ٹوین نے میرے (ہَک کے) بارے میں "ٹام سائر کی مہمات" میں بھی لکھا ہے، لیکن میری اصل کہانی تو یہی (ہکل بیری فن) ہے ـــــ اور صیغۂ واحد حاضر میں کہانی بیان کرنے کے باعث ہَک کو غلط ہجے اور غلط تلفظ کے استعمال کا موقع ملتا ہے۔ اور یہ انداز ایسا تھا جو

مارک ٹوین کے شیدائیوں کے لیے خاصا لطف انگیز تھا۔ اور بعض اوقات وہ اس قسم کی حرکتیں بھی کیا کرتا جن کے بارے میں وہ سوچتا کہ اگر ٹام سائر انہیں دیکھ پاتا تو بہت محظوظ ہوتا۔ تاہم یہ اس کی ہی آواز ہے جو بغیر تصنّع آمیزی کے، نیز صداقت شعاری سے بات کرتی ہے۔ بسا اوقات مارک ٹوین کے الفاظ سنائی دیتے ہیں۔ یہ ہمیشہ کی طرح پُر مزاح ہونے کے ساتھ ساتھ اس لڑکے کی جانب سے توجہ ہٹا لینے کی ترغیب دیتے ہیں جس کی ذات میں مزاح یکسر طور پر مفقود ہے اور جو اپنے آپ کو سمجھانے کی جد وجہد کرتا نظر آتا ہے۔ بہرصورت ہک ایک بہتر شاہد حال ہے، ٹام سائر سے کہیں زیادہ بہتر —— اس کی وجہ یہ ہے کہ ہک کی مدافعانہ فریب کاری سے یکسر مختلف، ٹام کی بچگانہ چالبازیاں اس کے ذہن کو دھندلا دیتی ہیں۔

ٹام جس میں لڑکپن کا انداز نمایاں ہے، مارک ٹوین کا محبوب کردار معلوم ہوتا ہے۔ ۱۸۹۴ء میں "ٹام سائر ممالک غیر میں" اور ۱۸۹۶ء میں "ٹام سائر کی جاسوسی" میں اس نے پھر اس کا ذکر کیا۔ یہ کتابیں ایک سوچے سمجھے منصوبے کا نتیجہ تھیں۔ یہ ابتدائی دور کی کامیاب کہانیوں کا چربہ ہیں۔ ان میں تجربے سے زیادہ خیالی مہمات کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ تاہم اس کے لڑکپن کے پس منظر میں ٹام کی ذات اب باعث رشک معلوم نہیں ہوتی۔ ایک بار کلیمنز نے، ایسے دو لڑکوں کی کہانی لکھنے کی بابت بھی سوچا تھا جو سن رسیدہ ہو کر اس گاؤں میں جو دریا کے کنارے واقع ہے، لوٹ آتے ہیں۔ "ہک ساٹھ برس کا بوڑھا ہو کر واپس آتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں سے واپس

آیا ہے ، البتّہ اب وہ مخبوط الحواس دکھائی دیتا ہے"۔ وہ اپنے آپ کو پھر ایک لڑکا تصوّر کرنے لگتا ہے اور جو بھی اس کے نزدیک سے گذرتا ہے ، اس کے چہرے میں وہ اپنے لڑکپن کے کسی نہ کسی دوست کی تلاش کرنے لگتا ہے ۔ دنیا میں برسوں کی آوارہ گردی کے بعد ، پھر ٹام بھی واپس آجاتا ہے اور دونوں اگلے وقتوں کے بارے میں بات چیت کرتے ہیں ۔" دونوں ہی اُداس اور تنہا ہیں ، زندگی کو ناکام سمجھتے ہیں ، جو کچھ بھی کبھی محبت کے قابل یا حسن و دلکشی سے معمور تھا وہ اب تہہ خاک ہے ۔"

لیکن اگر امریکہ کے قدیم ایام شاعرانہ طور پر بہترین تھے تو یورپ کے گذشتہ ادوار یقیناً اچھے نہیں تھے ۔کلیمنز کا خیال تھا کہ اس کے ہم وطنوں کی ایک بڑی تعداد ان رومانی مغالطوں میں مبتلا ہو گئی تھی ، جنہیں والٹر سکاٹ نے مقبول عام بنایا تھا ، اور جن کے باعث وہ اپنی عمروں سے کہیں زیادہ بڑے ٹام سائر بن گئے تھے ۔ سکاٹ "بے حد الھڑ ، نمائشی اور پوچ تھا !" اسے کہیں بھی تو "مخلص اور دیانت دار شناخت نہیں کیا جا سکتا"۔ اس کے کردار "بے جان ظاہر داریوں کے مظہر" "دودھ اور پانی کی آمیزش کے فریب محض" اور "غلیظ سائے تھے"۔ نہ ہی وہ امریکی رومان نگار جنہوں نے سکاٹ کا اثر قبول کیا تھا کسی طور بہتر کہے جا سکتے ہیں۔ کلیمنز کے جو مختصر مضامین مجموعوں کی صورت میں شائع ہوتے رہے ہیں ان میں مزاحیہ درک سے مملو عمل جرّاحی کا وہ نمونہ بھی ہے جس کا عنوان "فینی مور کوپر کے ادبی جرائم" ہے ۔ اس مضمون میں وہ اس بات کا پتہ لگاتا ہے کہ "ایک صفحے کے محدود دو تہائی حصے میں ادبی فن

کے ایک سو چودہ جرائم کو پرسے سرزد ہوتے ہیں جبکہ اتنی جگہ میں صرف ایک سو پندرہ ہی ممکن تھے"۔ وہ کوپر کی "کثیف حماقتوں" اور جزئیات کی جانب اس کی عدم توجہی کا ذکر کرتا ہے۔ وہ اس کے ڈرامائی لوازمات کے اس عجیب صندوق کا بھی ذکر کرتا ہے جس میں شاخ بریدہ جیسی از کار رفتہ جگت موجود ہیں۔ "جب کسی کا بھی قدم شاخ پر نہیں پڑتا، اور دو سو گز کے گرد و پیش تمام سرخ و سفید لوگوں کو نہیں چونکاتا تو اس صورت میں اس کی ہر کتاب کا یہ باب جامد بن جاتا ہے"۔ درحقیقت "چرمی جرابوں" کے سلسلے کو "سلسلۂ شاخ بریدہ"، ہی کہنا چاہیئے تھا۔ کلیمنز استدلال کرتا ہے کہ تاریخ کو یقیناً ایسی بکواس کے بغیر بھی پیش کیا جا سکتا تھا۔

چنانچہ کلیمنز نے انیسویں صدی کے ایک ایسے قوی الجثہ اور مشاق مستری کی مہمات لکھیں جو سر پر ایک ضرب کھانے سے ہی بے ہوش ہو جاتا ہے۔ اور جب اسے ہوش آتا ہے تو خود کو کیملاٹ کے نزدیک ایک درخت کے نیچے پاتا ہے۔ گرد و پیش کا منظر "ایک خواب کی طرح حسین اور اتوار کی مانند سنسان اور اداس" ہے۔ لیکن کلیمنز کی کہانی "شاہ آرتھر کے دربار میں "کنیٹی کٹ کا یانکی"، جو ۱۸۸۹ء میں شائع ہوئی تھی، طنز کی دو دھاری تلوار ہے۔ یانکی، جادوگر مرلن کے مقابلے میں خود کو ایک بہتر آدمی ثابت کرتا ہے اور وہ انفرادی اور اجتماعی مجادلوں میں بہترین سورماؤں پر غالب آتا ہے۔ وہ مقہور عوام الناس کے لیے بقول خود "ایک نیا راستہ"، کھولتا ہے۔ وہ عہد آرتھر کے انگلستان کو ایک ایسے کامل تکنیکی ادارے میں منقلب کر

دیتا ہے جس میں بارود اور میکانکی مہارت، جبر، بے انصافی اور اوہام پر فتح پاتی ہے۔ کلیمنز تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "لیکن میرا یہ یانکی مکمل طور پر ایک بے علم شخص ہے۔ یہ ایک مشین شاپ کا افسر اعلیٰ ہے، یہ ریل کا انجن اور کولٹ کا ریوالور بنا سکتا ہے، یہ ٹیلی گراف کی لائن بچھا سکتا ہے اور پھر اس میں آواز کی رو دوڑا سکتا ہے، لیکن بایں ہمہ وہ ایک بے علم شخص ہی رہتا ہے"!

"کنیٹی کٹ کا یانکی" کو مارک ٹوین کا بہترین امکانی قصہ کہا گیا ہے۔ اس میں ہجو، ہرزہ سرائی، مزاح، جمہوریت، مذہب اور مردود نسل انسانی۔ غرضیکہ ان سب عناصر کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ اس میں خاصا جھول ہے۔ تاہم حکایتیں کافی شگفتہ ہیں۔ کلیمنز اس کہانی کی یوں توضیح کرتا ہے کہ "یہ ایک ایسی کوشش ہے جس میں انگلستان کے قدیم ادوار میں محنت کشی اور بے آسرا غریب عوام کے کٹھن حالات زندگی کو تصور کی آنکھ سے دیکھ کر انہیں ایک خاص انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ پھر، واقعاتی طور پر، ان کا ان حالات سے تقابل کیا گیا ہے۔ جن کے تحت اس دور میں شہر اور چرچ کے بااختیار اور صاحب ثروت افراد پرمسرت زندگیاں گذارتے تھے۔" لیکن یانکی کی ہنرمندی اور ازمنہ وسطیٰ کی توہم پرستی کے مابین تقابل سے آخری طور پر جو چیز ابھر کر سامنے آتی ہے وہ ایک امریکی پیکر ہے۔ وہ ایک ایسا نابلد انسان ہے "جس کے پاس نہ تو کالج کی نفاستِ تعلیم ہے اور نہ ہی اس تعلیم کی کمزوری" لیکن پھر بھی وہ ایک ذہن رسا کا مالک ہے اور جو کا ملاً اور تباہ کن حد تک کامیاب

انسان ہے۔ کلیمنز نے یہ پیکر شعوری طور پر تراشا تھا یا غیر شعوری طور پر، بہرکیف یہی ایمج سیموئل کلیمنز اور اس کے متعدد دوستوں کا تھا۔ جس خاص ڈھب کے ادب کی وہ اور اس کے ساتھی تخلیق کر رہے تھے، یہ بات کسی حد تک اس کی ضرور توضیح کرتی ہے۔

اس دوران میں کلیمنز برسوں سوچتا رہا کہ اسے سیامی جوڑے کے بارے میں ایک پُر مزاح کہانی لکھنی چاہیئے۔ ان میں سے ایک تو نیک ہو اور دوسرا اوباش، اور اس نے ایسے قہقہہ آور مواقع پیدا کرنے کی بابت بھی سوچا جیسے کہ، مثال کے طور پر، اوباش بہت زیادہ پی جاتا ہے اور منشیات سے اجتناب کرنے والا مخمور ہو جاتا ہے، شاید افسانوی ادب کے لیے اس سے زیادہ بے سروپا ناموافق تصوّر نہیں ہو سکتا تھا، اور کلیمنز نے اسے مکمل طور پر کبھی عمل کے سانچے میں ڈھالا بھی نہیں۔ اس کی جزوی وجہ وہ یہ بتلاتا ہے کہ "ایک ایسا شخص جو ناول لکھنے کی صلاحیت لے کر پیدا نہیں ہوتا جب وہ ناول لکھنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے نہایت کٹھن لمحات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے یہاں کہانی کا کوئی واضح تصور نہیں ہوتا، حقیقت تو یہ ہے کہ اس کے ذہن میں کہانی ہوتی ہی نہیں۔ اس کے ذہن میں تو محض چند لوگ ہوتے ہیں، ایک آدھ واقعہ ہوتا ہے، نیز کسی مقام کا تصور —— اور وہ یقین کر لیتا ہے کہ ان لوگوں کو دلچسپ نتائج کے ساتھ ان واقعات میں سمو سکتا ہے۔!"

"وہ غیر معمولی جوڑے" میں جب اس نے اس کہانی کے ٹکڑے باہم

مربوط کیے تو اس نے اپنے اتفاقیہ ادبی طریقۂ کار کو کسی نہ کسی حد تک، ظاہر کرنے کی ظریفانہ کوشش کی ——— بالخصوص کرداروں کو پیش کرتے ہوئے جو پلاٹ کی پیچیدگیوں میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر، آغاز میں، روئینہ نامی ایک نسوانی کردار، بڑی آن بان سے ہمارے سامنے آتا ہے لیکن اس کردار کا یہ انداز آخر تک برقرار نہیں رہتا۔ چنانچہ کلیمنز نے یہ دیکھ کر کہا کہ "مجھے اس کی شخصیت میں صرف ایک شاندار مبالغہ بھر دینا چاہیئے ایسا کرتے ہوئے مجھے نہایت رنج ہوا، اس کی ذات سے اتنا کچھ وابستہ کرنے کے بعد، ایک مخصوص انداز سے میں نے اس جیسی تخلیق کی تھی، ہرچند کہ وہ اتنی نامعقول تھی، نہایت حماقت انگیز اور چڑانے والی باتیں کہتی تھی اور ناگوار طور پر جذباتی تھی۔" چنانچہ کھانے کے بعد، وہ اسے آتشبازی دیکھنے کے لیے عقبی صحن میں بھیج دیتا ہے اور "وہ ایک کنوئیں میں گر کر ڈوب جاتی ہے۔" یہ طریقۂ کار شاید بے ربط معلوم ہوتا تھا۔ "لیکن میں نے سوچا، ممکن ہے قاری اس جانب توجہ ہی نہ کرے کیونکہ میں نے موضوع کا رخ کسی اور ہی طرف موڑ دیا تھا، بہرکیف روئینہ کا کردار جس مقام پر جما ہوا تھا اس طریقۂ کار نے اسے وہاں سے سرکا کر راستے سے ہٹا دیا اور یہی سب سے اہم بات تھی۔"

ایک بار کامیاب ہو کر، اس نے اس حکمت عملی کو دوبارہ ان دو لڑکوں پر آزمانے کا فیصلہ کیا جو کہانی میں مزید کسی افادیت کے حامل نہیں رہتے (ایک رات وہ دونوں ایک بلی کو پتھر مارنے گئے اور کنوئیں میں گر کر ڈوب گئے) اسی طرح اس نے دو فالتو مدکی بوڑھی عورتوں کے ساتھ بھی یہی کیا (ایک رات

وہ دونوں ایک بیمار کی عیادت کے لیے گئیں اور کنویں میں گر کر ڈوب گئیں)
"میں کچھ اور لوگوں کو ڈبونے جا رہا تھا لیکن پھر میں نے یہ خیال ترک کر دیا۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ مجھے یقین تھا، اگر میں نے یہ سلسلہ جاری رکھا تو میں لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاؤں گا اور اس طرح ڈوبنے والوں سے انہیں ہمدردیاں پیدا ہو جائیں گی۔ اس کے علاوہ کچھ وجہ یہ بھی تھی کہ یہ کنواں بڑا نہیں تھا اور اس میں مزید ڈبونے کی گنجائش نہ رہی تھی۔"

افتادِ طبع اور زبان کے لحاظ سے یہی وہ مارک ٹوین تھا جسے اکثر لوگ بے حد پسند کرتے تھے۔ مزے کی بات تو یہ تھی کہ جو کچھ وہ کہتا تھا وہ اتنی سچی بات ہوتی تھی یا اس کا بے ہنگم اظہار بھی اتنا سچا معلوم پڑتا تھا گویا واقعی وہ لکھتا ہے یا پھر وہ لوگوں کا یہ گمان ہی پسند کیا کرتا تھا کہ وہ کہانیاں لکھتا ہے۔ ہنسی کا ہدف وہ خود ہوتا تھا یا پھر اس کے پہلو بہ پہلو یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایسے روایاتی اور جذباتی ادیبوں کو تضحیک کا نشانہ بنا رہا ہے جن کے عقبی صحن میں مناسب اور معقول کنویں موجود نہیں ہیں۔ اس بات سے تو لگ بھگ ہر شخص متفق تھا کہ وہ جس قدر پُر مزاح ہوتا تھا مفہوم کے لحاظ سے اتنا ہی بلیغ ہوا کرتا تھا۔ وہ جب اپنے مخاطبین، اپنی یا ایسے اشخاص کی خامیوں کی جانب اشارے کیا کرتا تھا جو ان کی طرح ہوشیار نہیں ہوتے تھے تو وہ لوگوں کو ہنساتے ہنساتے دہرا کر دیتا تھا۔ وہ ہنسی پاکیزہ کرنے والی ہوتی تھی۔ لیکن ساتھ ہی سکوں بخش بھی۔ چنانچہ معمولی نوعیتوں کی ایسی دلچسپ فرد گذاشتیں یقیناً محتاج اصلاح نہیں تھیں۔

"وہ غیر معمولی جوڑے" ۱۸۹۴ء میں "پڈن ہیڈ ولسن کا المیہ" کے تتمے کی حیثیت سے شائع ہوئی۔ یہ ایک بہتر کہانی ہے اور مؤخر الذکر سے بلا وجہ پیدا ہو گئی تھی۔ اس میں وہ بدلے ہوئے بچے کی وہی تدبیر بروئے کار لایا ہے جس نے "شہزادہ اور قلاش" کا پلاٹ مہیا کیا تھا۔ یہاں وہ ان دو بچوں کا ذکر کرتا ہے جو ایک ہی دن ڈاسن لینڈنگ مقام پر ڈرس کول گھرانے میں پیدا ہوتے ہیں ایک تو گھر کے سفید فام آقا کا بیٹا ہے اور دوسرا ایک مخلوط النسل کنیز، راکسے نا کا۔ یہ کنیز گہواروں میں بچوں کو اس طرح تبدیل کر دیتی ہے کہ اس کے داغدار بچے کی پرورش تو ٹامس اے بیکٹ ڈرس کول کی حیثیت سے ہوتی ہے اور وہی جائداد کا وارث بھی قرار پاتا ہے لیکن ٹام جو کہ سفید فام بچہ تھا۔ غلام شمار ہوتا ہے۔ نقلی ٹام اوباش اور چور ہو جاتا ہے، بالآخر وہ ایک دن قاتل بھی بن جاتا ہے۔ جب اس کی ماں راز فاش کرنے کی دھمکی دیتے ہوئے اس سے اپنا چال چلن درست کرنے کو کہتی ہے تو وہ یہ سن کر اپنی ماں کو ایک بردہ فروش کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے۔

غالباً "جذباتی طور پر ـــــ راکسے نا" پوری کتاب پر چھائی ہوئی ہے، لیکن مصنف اس کے کردار میں شرافت کی انہی خصوصیات کو ایک بار پھر بیان کرتا ہے جنہیں ہُک نے حبشی جم میں دریافت کیا تھا۔ تاہم نسلی موضوع پر راکسے نا کے رویے مبہم ہیں اور انہیں دیکھ کر وہ لوگ چکرا جاتے ہیں جو ان کا رشتہ کبھی ہُک کے رویے سے استوار کرتے ہیں اور کبھی جم کے رویے سے۔ جب اس کے بیٹے نے خود کو ہر طرح بد اطوار ثابت کر دیا تب اس نے اسے بتلایا کہ "تم جو کچھ

کر رہے ہو یہ اس حبشی کے باعث ہے جو تمہارے اندر موجود ہے تمہارے جسم کے اکتیس حصے سفید فام نسل کے ہیں، صرف ایک حصہ حبشی ہے اور یہی بے چارہ ادنیٰ سا ایک حصہ تمہاری روح ہے ——— یہ ایک حصہ سنبھال کر رکھنے کے قابل نہیں، اور باقی اکتیس اس قابل نہیں ہیں کہ انھیں بیلچے پر اچھال کر گٹر میں پھینک دیا جائے۔" شاید کلیمنز جیسے مصنف سے تسلسل و ربط کی توقع کرنا ایک غلطی ہو گی یا شاید اس سے بڑی غلطی یہ سوچنا ہو گا کہ اس کی ایک کتاب دوسری کتاب کی شرح کے طور پر استعمال کی جا سکتی ہے۔

امکانات کے پیش نظر، اہم تر کردار وہ ہے جس کا نام کہانی کے عنوان میں موجود ہے۔ فلسفیانہ اقوال کا شائق، وہ ایک وکیل ہے، لیکن بستی کے لوگ اسے ایک طرفہ طبیعت کا انسان اور احمق سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ گاؤں کے رواج اور معیاروں کے مطابق عمل نہیں کرتا۔ اس کے عجیب و غریب مشغلوں میں انگلیوں کے نشان لینا بھی ہے۔ نرینہ بچوں کی انگلیوں کے نشانات وہ قبل ازیں کہ تبدیل ہو جائیں انہیں محفوظ کر لیتا ہے۔ جب جعلی ٹام پر قتل کے مقدمے کی سماعت ہوتی ہے اور اٹلی کے جوڑوں پر (یہ سیام کے جوڑوں ہی کے خیال کا بقایا حصہ تھا) قتل کا الزام اس لیے عائد ہو جاتا ہے کہ شومئ قسمت سے گاؤں میں وہ اجنبی اور غیر ملکی تھے تو پڈن ہیڈ ان کی صفائی پیش کرتا ہے اور نہایت ڈرامائی انداز سے، اپنے پاس محفوظ، انگلیوں کے نشانات کے ذریعے انکشافات کرتا ہے کہ اصل قاتل راکسی نا کا بد قماش بیٹا ہی ہے۔

"پڈن ہیڈ ولسن کا المیہ"، جانی پہچانی فرد گذاشتوں، تصنع سے پُر نا گہاں

حرکات اور بے ربط باتوں سے بھرا پڑا ہے۔ کہانی کا عنوان دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ پڈن ہیڈ کا المیہ کیونکر ہے۔ تاہم اس حصّے میں خوبیاں بھی ہیں۔ اس نوع کی خوبیاں جیسی کہ بعد ازاں دیہاتیوں کے بارے میں شرووڈ اینڈرسن کی تحریروں میں ملتی ہیں۔ ان خوبیوں نے ہی اسے ''امریکی ادب میں نہایت غیر معمولی کتاب'' کی حیثیت سے شہرت بخشی ہے۔ بدی کو سمجھنے میں یہ کتاب ناقابلِ برداشت بصیرتوں سے پُر ہے۔ ہنسی ٹھٹھول سے مسخ ہونے کے باوجود، یہ کہانی معاشرتی برائیوں کی شناخت میں گہرے درک کا اظہار کرتی ہے، اور ان برائیوں کا ادراک ایسا ہی ہے جیسا کہ بعد ازاں ولیم فاکنر کی تحریروں میں ملتا ہے۔ اس مزاحیہ نقل کی تہہ میں جہاں خواب آلود گاوڑں ڈاسنز لینڈنگ کے لوگ چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں اور جن کے ہمرکاب ان کے وہ نمائندے آئے ہیں جو زوال آمادہ طبقۂ شرفاء سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان شرفاء کے نام فراوانیٔ الفاظ کے نمونے ہیں، جیسے پرسی نارتھمبرلینڈ ڈرس کول اور سیسل برلے ایسکس وغیرہ۔ اس سے طنز و تعریض کا ایسا رنگ پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ سارٹورائٹرز اور کامپ سنز کے آباؤ اجداد کی حیثیت سے شناخت کئے جا سکتے ہیں۔ خود پڈن ہیڈ بھی فاکنر کے گھون سٹیونز کے لیے جو یوکناپٹاوفا کاؤنٹی کی روایت و قدامت میں لپٹی زندگی پہ اظہار رائے کرتا ہے، ماڈل کا کام دے سکتا تھا۔ وہ مخلوط النسل جو خالصتاً سفید فام بنا پھرتا تھا اسے ہم ایک ایسا تجربہ سمجھ سکتے ہیں جو فاکنر کے ناول ''اگست میں روشنی'' کے جو کرسمس کی پیش گوئی کر رہا تھا۔ نیز اسے ہم فاکنر کے ''ایب سلم۔ ایب سلم''

میں سٹیفن کے نیم خاندانی بیٹے کی پیش گوئی بھی کہہ سکتے ہیں۔!

اس کہانی کی خامی اگر کچھ ہے تو وہ ادبی نوعیت کی ہے، یہ خیالات کی خامی نہیں بلکہ الفاظ کی ہے۔ مارک ٹوین اپنے مخصوص جانے پہچانے ڈھنگ سے کہانی کہہ رہا ہے، وہ ایک واقعے کے بعد دوسرا واقعہ لڑی میں پرو رہا ہے، یوں معلوم ہوتا ہے گویا ان واقعات کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ مزاح، حُزن، جذبہ، غیض و غضب اور پھبتی ایک طویل رفاقت کی بنا پر باہم شیر و شکر ہو رہے ہیں۔ آنسوؤں اور پیٹ میں بل ڈال دینے والے قہقہوں کے باوجود کہانی نیت کے اعتبار سے، سنجیدگی لیے ہوئے ہے، یہ انسان کے "ضمیر چھنالہ" سے پیدا شدہ مسائل کو احاطۂ فکر میں لاتی ہے۔ جب مارک ٹوین ہنستا ہے تو اس کی آنکھوں میں مشکل ہی سے چمک پیدا ہوتی ہے، شاذ و نادر یہ بات واضح طور پر دیکھنے میں آتی ہے۔ یہاں اس کا معاشرتی ضمیر صاف طور پر نظر آتا ہے۔ کہانی کے پس منظر میں اس کی تحقیر آمیز نظریں بڑی جرأت سے جھانکتی دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن اب اس کے الفاظ میں سچائی نہیں ہے یعنی وہ سچائی جو "ہک بائیکلمنز" کے الفاظ سے اس وقت جھلکتی تھی جب وہ دریا کے ایّام تربیت یاد کیا کرتا تھا۔ جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے کہہ رہا ہے لیکن ایسے لب و لہجے میں جو تصنّع سے ملوّث ہے، کیونکہ اب اس کے الفاظ وہ ہوتے ہیں جن کی عوام الناس اس سے توقع باندھتے ہیں۔

غالباً یہ فرض کرنا عین ممکن ہے کہ مارک ٹوین، جس کے سر کلیمنز کی بے مثل کامیابی کا سہرا تھا، پایانِ کار ایک رکاوٹ بن گیا۔ یہی وجہ تھی کہ سٹیفین کرین نے

ایک بار کہا تھا کہ "پُرمزاح رہنے کے لیے دو سو صفحات نہایت طویل پھیلاؤ رکھتے ہیں" اور یہ پھیلاؤ اس وقت اور بھی ضعف کا حامل بن جاتا ہے جبکہ مزاح نگار خود بھی یہ سمجھتا ہو کہ وہ جو کچھ لکھ رہا ہے فی نفسہٖ قابلِ مزاح نہیں ہے بلکہ صرف اس لیے پُرمزاح معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لکھنے کا ڈھنگ ہی مزاحیہ ہے۔ انسان میں کمینے پن کے کافی امکانات پائے جاتے ہیں اور یہ کہ وہ بآسانی غلط روش اختیار کر سکتا ہے۔ ان باتوں کو تو ٹویک بھی جانتا تھا، اگرچہ وہ حسّ مزاح سے بے بہرہ تھا۔ کلیمنز بھی اس حقیقت سے آگاہ تھا اور ایک طویل عرصے تک اس حقیقت سے باخبر رہا تھا۔

لیکن کلیمنز نے انسان کی زر پرستی سے متعلق اپنے مشاہدات کو کبھی مرکزی حیثیت نہیں دی۔ حتّٰی کہ "ہکل بیری فن کی مہمات" میں بھی ان کا سراغ نہیں ملتا۔ اس کی تحریروں میں خواہ مزاح کی چاشنی اور دل بہلاوے کی خاطر حکایات کا بیان یکساں طور پر کامیاب رہا ہو یا نہ رہا ہو، ایک بات بہرکیف تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ یہ طریقے ادب میں ایک عملی رویّے کی نمایاں طور پر غمازی کرتے ہیں۔ اس نے ایک بار اپنے ایک ادبی دوست سے کہا تھا کہ وہ جس کسی کو چاہے ایک کامیاب کہانی لکھنے کا گر بتلا سکتا ہے۔ اس ضمن میں محض اتنا خیال رہے کہ پہلے جملے سے قاری کی توجہ منعطف کرائی جائے اور پھر جس طرح بھی بنے اسے آخر تک برقرار رکھا جائے۔ بقول اس کے، کہانی رواں دواں اس طرح آگے بڑھتی رہتی ہے، جیسے کہ کوئی چشمہ بہتا ہے، قصّہ گو کی ذمہ داری تو صرف اتنی ہے کہ وہ اس کے بیشتر پُرپیچ راستوں میں قاری کی محفوظ و مامون رہنمائی کرتا رہے۔

۱۸۷۵ء اور ۱۸۹۴ء کے درمیانی بیس برسوں میں سیموئل کلیمنز نے اپنی بہترین کتابیں لکھیں۔ وہ دولت سے کھیلتا اور نہایت خوش و خرم زندگی گذارتا رہا۔ اس زمانے میں ہارٹ فورڈ کے متموّل اربابِ علم کی صحبت میں وہ دادِ عیش دیتا تھا۔ وہ تقریریں کرتا، کبھی کبھار کسی اخبار کا قلمدانِ ادارت سنبھال لیتا اور اپنے اشاعت گھر کے ذریعہ مقبولِ عام اور دیدہ زیب کتابوں کی فروخت کا کام کیا کرتا تھا، اس کی آمدنی بے حساب تھی جو بعض اوقات ایک لاکھ ڈالر سالانہ تک پہنچ جاتی تھی۔ لیکن اس کے پاس روپیہ جس تیزی سے آتا اتنی ہی تیزی سے خرچ بھی ہو جاتا تھا۔ خاص طور پر مبنی بر قیاس کاروبار میں وہ بے دریغ روپیہ جھونک دیتا تھا۔ مثال کے طور پر ٹائپ سیٹنگ مشین پر اس نے اپنی آمدنی کا وافر حصہ صرف کر دیا تھا۔ وہ کرنل سیلرز کی طرح لکھ پتی بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ اس کی طرح اس کے بیشتر معاصرین بھی اسی انداز سے سوچتے تھے لیکن ۱۸۹۰ء کے وسط میں وہ دیوالیہ ہو گیا۔ تب اس نے دنیا کا ایک دورہ کیا۔ جو اس کے لیے پہلے سے کہیں زیادہ شہرت اور عزت کا باعث بنا۔ ۱۸۹۷ء میں اس نے اپنی نئی کتاب "خط استواء کے ساتھ ساتھ"، لکھی۔ اس کی آمدنی سے اس نے اپنا قرض ادا کیا اور اسے ایک قسم کا نیا معاشی تحفّظ حاصل ہو گیا۔ لیکن ساٹھ برس کی عمر میں اس کا جاندار ادبی کیریر تقریباً ختم ہو کر رہ گیا۔

جب وہ یورپ میں مقیم تھا وہاں اس نے "جون آف آرک کی ذاتی یادداشتیں" کا مسوّدہ مکمل کیا۔ وہ زندگی بھر خلوص دل سے جون آف آرک کی

پوجا سی کرتا رہا تھا، چنانچہ یہ کتاب اس نے نہایت متانت سے لکھی۔ جب ۱۸۹۶ء میں یہ کتاب چھپی اس پر کلیمنز کا قلمی نام نہیں تھا۔ اسے ڈر تھا کہیں لوگ اسے بھی مارک ٹوین کی مزاحیہ کتاب سمجھ کر ہنسی میں نہ اڑا دیں۔ اس میں آرلینز کی دوشیزہ کے معصوم عقیدے کو جس خوبی سے پیش کیا گیا ہے، جدید دور میں اس کا افسوس ناک فقدان نظر آتا ہے۔ وہ ایک ایسی ہستی معلوم ہوتی تھی جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ "نسل انسانی نے شاید ہی کبھی ایسی غیر معمولی شخصیت پیدا کی ہو۔" اگرچہ وہ تجربات زندگی اور تربیت سے عاری تھی تاہم اس کے اندر پاکیزہ اور کامیاب نیکی کی ایک ایسی صفت موجود تھی جس پر کفر کا اتہام ان لوگوں نے لگایا جنھیں دنیا نیک کہتی ہے۔ اس نے برسوں جون کی زندگی کا تاریخی مطالعہ کیا تھا اور اس مطالعے کے دوران اس نے جو کچھ سیکھا تھا، اسے وہ من و عن پیش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کا یہ رجحان ہی اس کے لیے ایک رکاوٹ بن گیا اور وہ جون کی کہانی بہ احسن طریق لکھنے میں ناکام رہا۔ کم ہی قارئین اس کی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ اسے ایک بہترین کتاب کی حیثیت دی جا سکتی ہے۔

غم و آلام اور روز افزوں تلخ احساسات نے اس کی زندگی پر اثرات مرتب کرنے شروع کر دیئے تھے۔ ان وجوہ کی بنا پر اس کی بقایا زندگی تاریک ہو گئی۔ جب مارک ٹوین اپنی بیوی کے ساتھ بیرون ملک گیا ہوا تھا اس وقت اس کی بیٹی سوسی اچانک داغ مفارقت دے گئی۔ اس زمانے میں کئی برس تک اس کی بیوی ایک اذیت ناک عارضے میں مبتلا رہی، کچھ دنوں بعد وہ بھی

اس دار فانی سے رخصت ہو گئی، ابھی وہ ان صدموں سے سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ کرسمس کی ایک شام کو اچانک اس کی سب سے چھوٹی بیٹی بھی چل بسی۔ ۱۹۱۰ء میں اپنی وفات سے بیشتر کے پندرہ برسوں میں، مارک ٹوین اکثر اوقات غضبناک ہو کر اس دنیا کو تازیانے لگایا کرتا تھا، جس نے اس کے دل کو مجروح کیا تھا۔ ——— یا ایک بڑھتے ہوئے احساس مجبوری کے تحت، وہ اُس دنیا کو یاد کیا کرتا تھا جو اس کے لیے ختم ہو چکی تھی۔ ہارٹ فورڈ جہاں کبھی اس نے کامیاب اور پُرمسرت زندگی گذاری تھی، واپس جانے کا خیال بھی اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ چنانچہ ایک عالم اضطراب میں، وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہا، کبھی نیویارک میں اقامت گزیں ہوا تو کبھی اٹلی کے شہر فلورنس میں۔ کبھی صحت کی بحالی کے لیے برمودا جا پہنچا۔ بالآخر کنیکٹ کٹ کے دیہی علاقے سٹورم فیلڈ میں وہ مقیم ہو گیا۔ یہاں وہ غضبناک ہو کر لکھنے کے نت نئے منصوبے بناتا لیکن ان کی تکمیل کی صورت مشکل سے ہی نظر آتی تھی۔

قارئین جنہوں نے ٹام سائر کو احمق یا ٹک فن کو ایک نکما ماڈل تصوّر کیا تھا، جب انہوں نے "وہ آدمی جس نے ہیڈلبرگ کو خراب کیا" پڑھا تو انہیں یہ کہانی پسند کرتے ہی بن پڑی۔ یہ کہانی ۱۹۰۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ انسان میں موجود بنیادی بددیانتی کے بارے میں کلیمنز کی بڑی تیکھی قسم کی شہادت پیش کرتی ہے۔ یہ اس شرافت کے چھلکے اتار کر رکھ دیتی ہے جس کا لبادہ روایتی طور پر ہر قریئے کے لوگ پہنے رہتے ہیں۔ لوگ جو بظاہر نہایت دردمند اور شریف الطبع نظر آتے ہیں۔ مارک ٹوین نے ان کے اس مصنوعی خول کے تار و پود

بکھیر دیئے ہیں۔ اس نے دکھلایا ہے کہ جب کبھی بد دیانتی سے دولت حاصل کرنے کا موقعہ میسر آتا ہے تو اخلاق و شرافت کے یہ شہرت یافتہ مجسمے بھی نہایت آسانی سے لالچ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ انہیں بس یہ دھیان رکھنا پڑتا ہے کہ ہم پکڑے نہ جا سکیں۔ اس ضمن میں اس نے کسی کو نہیں بخشا۔ اِس کی نظر میں ہر نوع کی جد و جہد، ایک داؤ کے مترادف تھی۔ کسی امریکی نے بھی اس وقت تک ہمعصر اخلاقیات کی اتنی تباہ کن اور انسان دشمن مذمت نہیں کی تھی۔ اسٹیفین کرین کی کہانی "میگی" جو آٹھ برس پیشتر شائع ہوئی تھی اور تھیوڈور ڈریزیٹر کی "سسٹر کیری" جو اسی برس ہی شائع ہوئی تھی، دونوں کہانیوں میں جذبات کے اظہار میں اعتدال پسندی سے کام لیا گیا تھا جبکہ کلیمنز ان جذبات کو اس نہج سے محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ ایک سال بعد جب اس نے کہانی "تاریکی میں بیٹھا ہوا شخص" لکھی تو اس نے مشنریوں کی جنگجو اخلاقیات پر نہایت بے دردی سے حملہ کیا۔ ۱۹۰۵ء میں ایک دوسری کہانی "بادشاہ لیوپولڈ کی خود کلامی" میں پسماندہ ممالک کے مقدس استحصال کی حقارت آمیز مذمت کی۔ ۱۹۰۴ء میں "آدم کی ڈائری کے منتخب اوراق" اور ۱۹۰۶ء میں "حوا کی ڈائری" جیسے مضامین لکھے۔ یہ دونوں انوکھی اور عجیب و غریب روئدادیں ہیں جو یہ بتلاتی ہیں کہ دنیا کا اوّلیں مرد بھی عورتوں کے بہتر انتظام پر انحصار کرنے پر مجبور ہے۔ ازدواجی زندگی اور اہل و عیال کی محبت کے بغیر زندگی کی تجرد و تنہائی پر اس نے نہایت جذباتی طریقے سے اظہارِ خیال کیا ہے۔

۱۹۰۶ء میں اس نے اپنی خود نوشت سوانح لکھوانی شروع کی۔ اب وہ مدافعت مزاح کے بغیر ان واقعات اور شخصیات پر از سرِ نو غور کر رہا تھا جن سے اس کا سابقہ اپنی ڈانواں ڈول زندگی میں پڑا تھا۔ کچھ حصے اتنے بے کم و کاست تھے کہ اس نے سوچا کہ انہیں اس کی موت کے سو سال بعد تک نہیں چھپنا چاہیے، تاہم دوسرے حصے فوراً "نارتھ امریکن ریویو" میں سلسلے وار چھپنے کے لیے بھیج دیئے گئے۔ اس کے منتخب حصے "مارک ٹوین کی خود نوشت سوانح"، مطبوعہ ۱۹۲۴ء "مارک ٹوین ان ایرپشن"، مطبوعہ ۱۹۴۰ء اور "دی آٹو بیاگرافی آف مارک ٹوین"، مطبوعہ ۱۹۵۹ء، میں جمع کر دئے گئے ہیں۔ ہر کتاب ایک محبوب و مقبول امریکی (مارک ٹوین) کی مؤثر تصویر کشی میں گرانقدر اضافہ کرتی ہے۔ وہ ایک ایسا امریکی تھا جو بڑبڑاتا اور غرّاتا رہتا تھا، جسے تمباکو نوشی کی بے حد علت تھی، جو اپنے متمول دوستوں سے سکاچ وہسکی مانگ مانگ کر پیا کرتا تھا لیکن جس کا اپنا مقام تھا، اور جسے ساری دنیا جانتی اور پیار کرتی تھی۔

۱۹۰۶ء میں اس نے ایک پرائیویٹ اور گمنام کتاب بعنوان "آدمی کیا ہے"، لکھی جسے وہ اپنی "کتاب بدی" کہا کرتا تھا۔ اس میں انسان کے بارے میں شدید نوعیت کی تشخیص ملتی ہے، وہ انسان کو ایک میکانکی عمل کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ وہ تقدیر کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہے "اس کے دماغ کی تشکیل اس طرز پر کی گئی ہے کہ وہ کچھ بھی تو معرضِ وجود میں نہیں لا سکتا۔ آدمی ایک گرگٹ کے مانند ہے جو "اپنی فطرت کے قانون کے مطابق

...... جس جگہ رہتا ہے وہیں کا رنگ اختیار کر لیتا ہے ــــــ گردوپیش کے ماحول کے اثرات سے اس کی پسند، نفرت، سیاست، مذاق، ضابطۂ اخلاق اور مذہب ترتیب پاتا ہے۔ جو کچھ بھی وہ جانتا ہے، جو کچھ بھی وہ عمل کرتا ہے، اس کا تعین ایک اٹل قانون کے تحت ہوتا ہے ......

"مہد سے لحد تک انسان ایک بھی ایسا کام نہیں کرتا جس کا اولین اور اہم ترین مقصد اپنے لیے ذہنی سکون اور روحانی مسرّت حاصل کرنے کے علاوہ اور کچھ ہو!" انسان وہی کچھ ہے جو کچھ کہ اصل میں ہے، اور دنیا کی کوئی شے اسے نہیں بدل سکتی۔ وہ خود پسندی اور خودستائی کا پیکر ہے۔ بچوّں کی مانند، وہ آزاد ارادے، محبت اور رحم کی باتیں کرتا ہے۔ اس کی یہ باتیں ایسے افسانے ہیں جنہیں وہ اپنے اطمینان کی خاطر جنم دیتا ہے۔ "جب کبھی آپ کسی انفرادی قربانی یا فرض برائے فرض، کا ذکر پڑھیں یا سنیں اور اس کا تجزیہ کر کے دیکھیں، اور اس کے اصل محرّک کی تلاش کریں تو اسے آپ ہمیشہ موجود پائیں گے۔"

یہ کتاب بدی کی حامل تو نہیں ہے البتہ یہ اکتاہٹ ضرور پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے الفاظ بے جھجک اور مایوس کُن طور پر ان انسانوں کے خیالات کی صدائے بازگشت ہیں جو اپنی ذات سے ماورا کچھ قوتوں کے اسیر ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ یہ الفاظ تعزیری بھی ہیں اور جرم کو خفیف ثابت کرنے والے بھی ــــــ گویا مصنف خود کو اور ساتھ ہی دوسروں کو بھی یہ جتا رہا ہے کہ اس نے یا دوسرے لوگوں نے بالجبر جو کچھ کیا ہے تمام

انسانوں کے لیے ایسا کرنا کیوں ضروری تھا۔ اس میں نہ تو تحلیل و تجزیے کی کمی ہے اور نہ ہی غیض و غضب کی۔ اپنی ایک مخصوص سطح پر، کتاب بہ احسن طریق استدلال کرتی ہے۔ یہ اپنا مؤقف بھی پیش کرتی ہے، البتہ ایک کمی یہاں بری طرح کھٹکتی ہے۔ اس میں ناگزیر لفظ کی وہ قوت نظر نہیں آتی جو کسی شے کو بیان کرنے میں گنجینۂ معنی بن جاتی ہے۔ اس قوت کا شئے متعلقہ سے گہرا رشتہ ہوتا ہے اور عام الفاظ مفہوم کی اس تہہ تک کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ ایک زمانہ تھا جب کلیمنز کے الفاظ اشیائے متعلقہ سے گہری وابستگی کا احساس دلاتے تھے، لیکن اب وہ محض اشارے ہی کرتے تھے، کہنے کے لیے ان کے پاس کچھ زیادہ نہ تھا۔

اپنی موت سے چھ ماہ قبل کلیمنز نے "کپتان سٹورم فیلڈ کی سیاحتِ فردوس سے ایک اقتباس" شائع کی۔ یہ ایک مقبول عام کہانی تھی جس کے بارے میں وہ کئی برسوں سے غور و پرداخت کر رہا تھا۔ اس میں مزاح، جذبے یا انسانی کمزوری کی تحلیل، غرضیکہ ہر وہ تدبیر جو مارک ٹوین سدا استعمال کرتا رہا تھا اب ایک بدمزاج اور کور ذوق جہاز راں کی مہمات لکھتے ہوئے بروئے کار لاتا ہے۔ یہ جہاز راں، ایک پرندے کے مانند، ہوا کو چیرتا ہوا، چشم زدن میں جنّت کی جانب رواں دواں نظر آتا ہے۔ راستے میں وہ ایک دمدار ستارے پر اس طرح دوڑ لگاتا ہے جیسے دخانی کشتیوں کے ملّاح مسی سپی پر ریس کیا کرتے تھے۔ اسے موزوں بال و پر اور مناسب بربط حاصل کرنے میں دقّت پیش آتی ہے۔ ایک سیّارے سے آنے والے لوگوں کے لیے وہ کافی دیر تک

ایک معقول آرام گاہ کی تلاش کرتا ہے۔ خدا خدا کرکے یہ جگہ ملتی ہے۔ یہ لوگ جس سیارے سے آئے ہیں فرشتے اس کی اس درجہ بے قدری کرتے ہیں کہ اسے آسمان کا گومڑ کہہ کر پکارتے ہیں۔ وہاں اسے لوگوں سے گفتگو کرتے ہوئے بے حد پریشانی ہوتی ہے۔ وہاں کے لوگ عجیب مضحکہ خیز زبانیں بولتے ہیں۔ پھر جب وہ اڑنا سیکھتا ہے تو بری طرح ٹھوکریں کھا کھا کر گرتا ہے، یہودیوں اور مسلمانوں کو جنّت میں دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہتی، اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ شکسپیئر کو موچیوں، گھوڑے کے تاجروں اور چاقو پر سان رکھنے والوں سے بھی نچلا درجہ دیا گیا ہے تاکہ ٹینیسی کے اُس گمنام درزی کے لیے جگہ بنائی جا سکے جو ایسی شاعری کیا کرتا تھا کہ ہومر اور شکسپیئر بھی اس کے معیار پر پورے نہ اترتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے اشعار کوئی چھاپتا تک نہ تھا، اس کے ہمسایوں کے سوا کوئی اور انہیں پڑھتا بھی نہ تھا، اور یہ لوگ بھی محض اس کا مذاق اڑاتے تھے۔" ٹھٹھول اور تضحیک میں چھپی ہوئی دانائی کی شناخت کرنا ہی بالعموم مارک ٹوین کے ایک سچے مدّاح کا امتحان سمجھا جاتا ہے۔

لیکن کلیمنز کے انتقال کے بعد جو کہانی "پُراسرار اجنبی" کے عنوان سے چھپی اس کی ویران یاسیت کو سمجھنے کے لیے کسی تشریحی نکتہ سنجی کی ضرورت نہیں۔ اس کہانی کا پس منظر آسٹریا ہے۔ زمانہ ۱۵۹۰ء کا ہے۔ یہاں ایزل ڈورف نامی ایک گاؤں ہے، جسے لہو و لعب کے لیے ایک جنّت تصوّر کیا جا سکتا ہے۔ اس نوع کے مقام سے ٹام اور ہک اچھی طرح واقف تھے۔

اس گاؤں میں تین لڑکے ہیں۔ ایک دن ایک فرشتہ یہاں آتا ہے۔ یہ فرشتہ ابلیس کا ہمنام اور بھتیجا ہے۔ وہ ان لڑکوں کو معجزے دکھلا کر خوش کرتا ہے۔ وہ مٹی کے چھوٹے چھوٹے پتلے بناتا ہے، ان میں روح پھونکتا ہے۔ یہ پتلے جب زندگی سے معمور ہو جاتے ہیں تب انہیں وہ مکھیوں اور مچھروں کی طرح روند ڈالتا ہے۔ لڑکوں کو یہ فعل نہایت ظالمانہ معلوم ہوتا ہے لیکن وہ انہیں سمجھاتا ہے کہ یہ ظلم نہیں ہے، محض متلوّن مزاجی ہے۔ انسان اسے یوں سمجھ سکتا ہے کہ یہ ہی ان پتلوں کا مقسوم ہے، انسان، جو اخلاقی احساس کے تحت ناکارہ ہو کر، حالات کا غلام بن جاتا ہے اور جس کی بصیرت موہوم خیالات کے زیرِ اثر مسخ ہو جاتی ہے، وہ خود کو ان آدرشوں کی وجہ سے تباہ کر لیتا ہے جو محض تخیل کی دنیا میں اپنا وجود رکھتے ہیں۔ یہ انسان بھی کس قدر احمق ہے! اس کی توقعات بھی کس قدر مجنونانہ ہیں۔ ”دنیا کا کوئی بھی ذی فہم شخص، جو زندگی کی حقیقت سمجھتا ہے، اس دنیا میں خوش نہیں رہ سکتا، وہ جانتا ہے کہ زندگی کس قدر خوفناک حقیقت کا نام ہے“! کیونکہ ”نہ خدا ہے، نہ کائنات، نہ نسل انسانی، نہ دنیوی زندگی، نہ بہشت، نہ دوزخ —— یہ سب کچھ ایک خواب ہے، ایک اوٹ پٹانگ اور احمقانہ خواب“! فرشتے نے کہا ”بجز، تمہارے کوئی بھی تو شے وجود نہیں رکھتی اور تم محض ایک ”خیال“ ہو —— ایک بے سر و پا خیال، ایک ناکارہ خیال، ایک بے خانماں خیال جو بے معنی ابدیت کے چکر میں تنہا اور اداس بھٹکتا پھرتا ہے“!

ڈگلس کی بیوہ کا محبت کے مذہب پر جو کبھی یقین تھا یا ہک کے لیے

روپوشی کے ذریعہ دنیا سے فرار کا جو ایک امکان نظر آتا تھا ان میں سے اب کوئی بات بھی باقی نہیں رہتی۔ ۱۸۸۵ء میں کلیمنز نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا ایک بار پھر وہ ان کا اعادہ کرتا ہے۔ ان خیالات نے اس دور کے کافی لوگوں کو تشکیک میں مبتلا کر دیا تھا لیکن اب دوسرے لوگ ان ہی خیالات کا اس سے بہتر انداز میں اظہار کر رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اب اس کے ہاں یاس اور طیش کی کف در دہاں تازہ بصیرتوں کی بدولت زبان و بیان کی سحر آفرینی مفقود ہو چکی تھی۔ وہ ابلیسی فرشتہ اب بھی بات کرتا ہے لیکن اس کی زبان پر الفاظ کلیمنز کے ہی ہوتے ہیں۔ وہ صرف ان لوگوں کو ہی لعنت ملامت نہیں کرتا جو اس کا مطالعہ کرتے ہیں بلکہ وہ خود کو بھی ہدف ملامت بناتا ہے۔ وہ الزام دیتے ہوئے کہتا ہے "آپ مزاح کی ایک دوغلی حس رکھتے ہیں۔ اس سے زیادہ آپ کے پاس کچھ بھی نہیں۔ آپ ہزاروں معمولی اور ادنیٰ چیزوں کے مضحکہ خیز پہلو دیکھتے ہیں، بالخصوص صریح لغویات کے مضحک پہلو یعنی ایسی بے ہودگیاں اور حماقتیں جو آپ کو قہقہے لگوا سکتی ہیں" —— لیکن "دس ہزار اعلیٰ درجے کی مضحکہ خیزیاں جو انسان کے بچگانہ پن کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں، آپ کی دھندلی نظروں سے پوشیدہ رہتی ہیں۔ کیا ایسا کوئی دن آئے گا جب نسل انسانی ان بچگانہ حرکتوں کا سراغ لگا لے گی، ان پر ہنس سکے گی اور ہنس کر انہیں ملیا میٹ کر سکے گی؟"۔ ایک بے عیب دنیا میں، مضحکہ خیزی کی گنجائش نہیں ہو سکتی لیکن ہماری یہ دنیا بے عیب نہیں ہے۔ عالم غربت میں، "انسان کے پاس بلاشبہ ایک نہایت ہی

مؤثر ہتھیار ہوتا ہے اور وہ ہے اس کا قہقہہ!۔ قوت، دولت، ترغیب، التجا، تہذیب —— غرضیکہ یہ تمام طریقے، بڑی سے بڑی ابلہ فریبی کے لیے حرکت میں آسکتے ہیں، صدی بہ صدی، یہ اس ابلہ فریبی کو کسی حد تک کم اور کمزور کرسکتے ہیں لیکن صرف قہقہہ ہی ایک ایسا ہتھیار ہے جو ایک ہی وار میں اسے ریزہ ریزہ اور تباہ کرسکتا ہے۔"

ایک بار مارک ٹوین نے ایک دوسرے موڈ میں یہ بھی لکھا تھا "مزاح تو صرف ایک خوشبو اور آرائش کا نام ہے۔" اگر اسے واقعتاً اپنی بقا کے لیے کامیاب ہونا ہے تو مخفی طور پر اسے تبلیغ و تدریس بھی کرنی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ جیمس ٹی فاریل جیسا مارک ٹوین کا سنجیدہ مداح، ہک اور ٹام کی شخصیتوں میں، "دو ایسی انگلیاں دیکھتا ہے جو امریکی تاریخ کی جانب اتہام آمیز اشارے کر رہی ہیں۔" جو نہایت بیدردی سے یہ سوال پوچھ رہی ہیں کہ آخر امریکہ میں یا کسی بھی جگہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ایک آدمی لڑکپن میں جو آثار ظاہر کرتا ہے بعد ازاں شاذ ہی ویسی شخصیت بن پاتا ہے۔ جن نظروں سے ایک نوخیز لڑکا دنیا کو دیکھتا ہے، کلیمنز نے بھی دنیا کو انہیں نظروں سے دیکھا تھا یعنی تفریح اور آزادی کے بے پناہ امکانات کے ساتھ۔ ایک لڑکے ہی کی طرح جب وہ پریشان ہو جاتا تو ہنسنے لگتا تھا۔ آزمائش کے طور پر اگر وہ سنجیدہ بھی ہوتا تو پہلے ہنس لیتا تھا، تاکہ جو اپنی ہنسی اس کو اپنا ہدف نہ بنا سکے بلکہ وہ خود بھی اس ہنسی میں شریک ہو سکے۔ سخت غصّے کی حالت میں بھی وہ کچھ نہ کچھ پُر مزاح دکھائی دیتا تھا۔ یہ اس کی شخصیت کا ایسا پہلو تھا کہ ترنگ

اور مسرّت کے عالم میں وہ خود اس کا بھی مضحکہ اڑا سکتا تھا۔ اس بارے میں رائٹ مورس تہمت لگاتے ہوئے کہتا ہے کہ "اچھی زندگی سے متعلق ایک لڑکے کے دیہقانی تصور سے لے کر اس زندگی پر ایک لڑکے کی نکتہ چینی تک مارک ٹوین کے یہاں معصومیت کا جو افسوں ملتا ہے وہ اسے بلوغت اور پختگی کی دنیا سے الگ کر دیتا ہے۔ اس نے فن کے بغیر اتنی کامیابی سے جو حاصل کیا تھا وہ کہانی کہنے کا گر تھا۔ اِس نے قصہّ گوئی کا جو نظریہ اختراع کیا تھا اس کے ہموطنوں نے اس کی زور و شور سے تعریف و توصیف کی۔ قصہّ گوئی کی اس قدر فطری صلاحیتوں کے باوصف اس ضمن میں اس نے مزید کوششیں کیوں نہیں کیں؟ اس سوال کا جواب دینے میں کلیمنز کی معذوری ہی مارک ٹوین کی شخصیت اور اس کے عہد خود آفریں کی تشریح کر سکتی ہے۔ تاہم یہ حقیقت اس کے بارے میں سب کچھ بیان نہیں کرتی، حتیٰ کہ اہم ترین نکتے بھی محتاجِ تشریح رہ جاتے ہیں۔

سیموئل کلیمنز، مارک ٹوین بن گیا یا پھر اس نے اس مارک ٹوین کی تخلیق کی جس نے بے اندازہ ہنسی ٹھٹھول کو جنم دیا۔ تاہم وہ محض مسخرہ نہ تھا، ایک مزاحیہ حقیقت نگار کی حیثیت سے اس کا مقام لارنس، سٹرن، ڈکنس، جوائس، فاکنر اور کاہو کے پہلو بہ پہلو آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان متذکرہ فنکاروں کی طرح اس کی نگاہوں نے بھی مقامی حقائق سے بلند ہو کر ان خصوصیات کو دیکھا ہے جو بعض اوقات شرمناک طور پر تمام انسانوں ہی کا مقدر ہیں۔ اسے محض اس طرح یاد رکھنا کہ وہ لڑکپن کی مہمات کا خالق تھا یا اسے محض امریکی سرحدی

علاقے کی یادگار رہا اسے اپنے وطن کی افتادِ طبع کی آوازِ محض سمجھنا اس کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ اس کا فنّی کارنامہ آخری طور پر اس کے خیالات کی تردید کر دیتا ہے اور اس طرح اس کی ادبی کامیابی کی توثیق ہو جاتی ہے۔ امریکی ادب میں جو کچھ بھی اعلیٰ و ارفع ہے اس کا آغاز اس کی ذات سے ہی ہوا تھا اور لائنل ٹرلنگ نے سچ کہا ہے کہ "لگ بھگ ہر وہ ہمعصر امریکی ادیب جو نثر کے مسائل اور امکانات سے دیانتدارانہ سروکار رکھتا ہے، اسے بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر...... (اس کے) اس اسلوب کے اثر کو محسوس کرنا پڑتا ہے جو مطبوعہ صفحے سے نکل کر قلب میں جاگزیں ہو جاتا ہے، جو ہمارے کانوں میں سنی ہوئی آواز کی طرح براہِ راست گونجنے لگتا ہے اور یہ آواز بے ریا سچائی کی ہی ہوتی ہے۔"

جب اس نے عوام کی توجہ کامیابی سے اپنی طرف منعطف کرالی تھی، اس سے دس برس پیشتر ہی ملک کے ایک اہلِ نظر نے اس کی آمد کی پیش گوئی کر دی تھی، یہ اہلِ نظر عام طور پر لوگوں کو "واہموں کا شکار" کہا کرتا تھا اور زندگی کو "خوابوں کا ایک تسلسل"۔ سیموئل کلیمنز جو دریائے مسی سپی پر ایک ملّاح تھا ابھی مارک ٹوین کی حیثیت سے مشہور نہیں ہوا تھا۔ تاہم ایمرسن نے جب یہ کہا تھا کہ "ایک مزاح نگار جو اچھی خاصی یاوہ گوئی میں دو ایک باتیں عقل و فہم کی کہہ جاتا ہے" تو اس کے ذہن میں یقیناً کوئی اس کی طرح کا شخص موجود تھا۔ اس نے اپنے ہم صحبت لوگوں کو اس دعوے سے صدمہ پہنچایا تھا کہ خدا کے دو خاص اوصاف ہیں —— قوت اور خندہ زنی اور یہ کہ ہر نیک انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ طرب و مزاح کو قائم و برقرار رکھے۔

ادب کے مطالبات کی خاطر جسے وقف کر دینا کہتے ہیں اس مفہوم میں شاید اس کے یہاں خلوص مقصد کی بنیادی کمی تھی ("اس کے علاوہ لوگوں نے اور بھی فضول باتیں کی ہیں") جس کی وجہ سے سیموئل کلیمنز ازاوّل تا آخر کامیڈی کو برقرار رکھنے کی استعداد سے محروم ہو گیا تھا، قہقہہ احساس خوشی ہی نہیں ہوتا۔ پرمزاح افراد آنسوؤں کی جانب مائل ہونے میں خاصے بدنام ہوئے ہیں، تمسخر آمیز انداز نظریے انسان کو اپنی ذات کا اعلیٰ ترین عرفان بخشنے یا اس کے امکانات کا جائزہ لینے میں کبھی سہارا نہیں دیا، کیونکہ، جیسا کہ باڈیلیئر نے ایک بار کہا تھا "کومک نقل ہوتی ہے، تخلیق نہیں"۔ تاہم اس کے ہموطن جو کچھ کہ مارک ٹوین کے فن اور اس کی شخصیت میں نہیں تھا، اس پر کم ہی طنز و تعریض کرتے ہیں، جو کچھ کہ وہ تھا، ان کی نظر میں وہ بہت کافی تھا۔ غالباً یہ بات درست ہے کہ کومک کی حس یعنی ہنسنے کی استعداد اس فرد ہی میں ہوتی ہے جو کہ ہنستا ہے، نہ کہ اس میں جو اس ہنسی کی تحریک کا باعث بنتا ہے، ہزاروں معمولی اور ادنیٰ درجے کی چیزیں جو اس کے ہم وطنوں میں خوش طبعی کی تحریک پیدا کرتی تھیں ان کا اظہار جس شد و مد سے ہوتا تھا اتنا سیموئل کلیمنز کے یہاں موجود نہیں تھا۔ وہ تو گاہ بگاہ ہی کھرے اور اعلیٰ درجے کے فکاہات پیش کرتا تھا، لہٰذا اس معاملے میں تنہا اس کا ہی قصور نہ تھا، نہ ہی اپنے غیض و غضب کے اظہار کے لیے اسے موردِ الزام ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ صرف اس حد تک اسے ضرور الزام دیا جا سکتا ہے کہ اس کے یہاں غیض و غضب کا اظہار اس وقت ہوا جب اس کے الفاظ میں شگفتگی اور تازگی باقی نہ رہی تھی۔

جب اُس نے اپنے ہم وطنوں کو یہ بتلایا کہ وہ کس قماش کے لوگ ہیں تو اس سے ان لوگوں کو صدمہ ہوا ——— تاہم یہ لوگ ہنستے رہے۔ ان لوگوں کی مسلسل ہنسی مارک ٹوین اور خود ان لوگوں کی فطری صلاحیتوں کا پتہ دیتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس سے ان حدود و قیود کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے جو ان میں باہم مشترک ہیں۔

PRINCIPAL WRITINGS OF MARK TWAIN

The Innocents Abroad; or, The New Pilgrim's Progess

Roughing it

The Gilded Age

The Adventures of Tom Sawyer

A Tramp Abroad

The Prince and the Pauper

Life on the Mississippi

The Adventures of Huckleberry Finn

A connecticut Yankee in King Arthur's Court

The Tragedy of Pudd' Nhead Wilson

Personal Recollections of Joan of Arc

Following the Equator

The Man that Corrupted Hadleyburg and Other Stories and Essays,

Extract from Captain Stormfield's Visit to Heaven.

The Mysterious Stranger

Mark Twain's Autobiography

Marktwain's Letters From The Sandwich Islands.

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
★ MAILSI ★

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

ام جهرل

09 FEB 2021

ρ/40